ناول



خالی

# ذبح

## (ناول)

مصنف

## مشرف عالم ذوقی

ناشر





ZIBAH

WRITER : MUSHARRAF ALAM ZAUQUI

Edition : 2014

Rs. 168/-

نام کتاب : ذبح

مصنف : مشرف عالم ذوقی

رابطہ : D-304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی 110031

09310532452,0995853881

E-mail : zauqui2005@gmail.com

کمپوزنگ : سعید احمد معروفی 9560062765

تعداد : 500

صفحات : 408

نئی صدی کے نام

کہ اب ہم تیار نہیں ہیں

بار بار

ذبح ہونے کے لیے!



خالی

خالی



تاریخ......

## ضروری لکھنا یہ ہے کہ ہم خیریت سے نہیں ہیں......

سست لوگوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا چست ہو جائے گی

بدصورتوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا خوبصورت ہو جائے گی

بے وقوفوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا عقل مند ہو جائے گی

بیماروں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا تندرست ہو جائے گی

افسردہ دلوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا خوش و خرم ہو جائے گی



بڈھوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا جوان ہو جائے گی

دشمنوں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا دوست بن جائے گی

بروں کو ذبح کیا جائے گا
دنیا اچھی بن جائے گی

جرمن شاعر ایریش فریڈ کی ایک نظم سے

خالی

## (۱)

ابھی صبح کے دس بجے تھے۔یعنی پہاڑ جیسے دن کو کاٹنا تھا۔ بے روزگار قدم چلتے چلتے تھک جاتے۔دن تو کاٹے نہیں کٹتا۔کتنا لمبا ہوگیا ہے دن۔انیسو کے سیلون میں بیٹھو یا کمانی کی چائے کی دکان پر۔لفنگا،موالی،ان الفاظ سے تو جیسے راستہ چلتے چلتے دوستی ہوگئی ہے۔لیکن اور کہاں جائے گا اسلم؟ کیا کرے گا؟ ملا کی دوڑ مسجد تک، گھر سے نکلے تو انیسو کے یہاں تھوڑا سستا لیا،ادھر ادھر کی خبروں کا جمع خلاصہ ہوگیا۔

وہاں ان باتوں کے علاوہ خبیثوں کے پاس دوسری باتیں ہی کیا تھیں۔''سالوں نے علی گڑھ میں مسلمانوں کو چن چن کر مارا ہے۔''

''انیسو حجامت بناتے ہوئے قہقہہ لگاتا......سالے ہم سب کا پورا ختنہ ہو چکا ہے......ماریں گے نہیں تو اور کیا کریں گے۔''

''لو اس کی سنو......'' دوسرا بولتا۔

''اے بیٹا بال ٹھیک سے کاٹنا۔کہیں کان کٹ گئے تو؟''

انیسو پھر قہقہہ لگاتا......''ارے جو نہیں کٹنا تھا جب وہی کٹ گیا تو اب دوسرے کی فکر کیا کرنا......؟''



اسلم سنتا ہے۔کبھی کبھی سوچتا بھی ہے، پھر ان موالیوں کی بحث میں حصہ بھی لیتا ہے۔''ابے تو ایسا کیوں بولتا ہے کہ کٹ گیا ہے؟''

''کٹا کچھ نہیں ہے۔مسلمان جب نعرہ تکبیر لگائیں گے نا،تب دیکھنا۔''

''لو اس کی سنو۔تب کیا ہوگا؟'' کمانی چائے کی دکان چھوڑ کر آجاتا۔''سن سالے! تب زمین پھٹ جاوے گی۔مسلمان کی آواز میں بہت طاقت ہے۔''

''تبھی تو صدام نے ایران کو چنوا دیا؟''

انیسو بولتا تو رفیع بھائی اخبار پڑھتے پڑھتے قہقہہ مار کر ہنستے۔

''ارے میاں اخبار پڑھا کرو۔'' وہ ناک سے بولتے تھے، پر پڑھتے خوب تھے۔اسی لیے لونڈے ان کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔رفیع میاں انیسو کی جاہلیت پر دیر تک 'مسکی' چھوڑتے رہتے۔

''میاں باتاں کیا ہیں؟'' انیسو نقل اتارتا۔

رفیع میاں ہنستے ہوئے کہتے۔''ایران نہیں میاں عراق کہو اور سچ کہوں تو غلطیں صدام کیں بھی نہیں...... بیچارہ مفت کا بدنام ہوا۔''

انیسو اپنی معلومات کی توپ چھوڑتا۔''صدام نے تو دنیا کے سبھی اسلامی دیش کو ایک کرنا چاہا تھا۔''

''اور کیا۔اگر اس کی چال کامیاب ہوجاتی تو ہم ہندوؤں کے ہاتھوں مر نہیں رہے ہوتے۔؟''

''پتہ نہیں ہمارے باپ۔دادا پاکستان کیوں نہیں چلے گئے۔''

●●

اسلم کو بس لے دے کر سارے فساد کا حل یہی لگتا کہ اگر پاکستان چلے گئے

ہوتے تو بے روزگاری نہیں ہوتی۔ سنتے ہیں پاکستان میں سقوں (بھشتی) کی اب بھی کافی پوچھ ہے۔ ابا بھی بے کار نہیں ہوتے اور اسے بھی کوئی نہ کوئی روزگار مل گیا ہوتا۔ وہ جانتا تھا......سنی سنائی باتوں سے اتنا تو آشنا تھا ہی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اسے روزگار نہیں ملنے والا۔ انیسو بھی کہتا ہے کہ ساری بڑی نوکریوں پر ہندوؤں کے نام لکھے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے تو چھوٹی چھوٹی نوکریاں لکھی ہیں، تاکہ نوکر بننے کی ذلت بھی یہ مسلمان قبول کر سکیں۔

''ذلت''

''بدھو۔'' انیسو ہنستا ہے۔ ''لو اب اس کی سنو، کمبخت کو یہ بھی نہیں پتہ کہ پہلے یہاں مسلمانوں کا راج تھا۔ اس لیے تو ہندو اب ماتحت بنا کر رکھنا چاہتے ہیں مسلمانوں کو۔''

''بھونس ری......کے''

بینچ پر بیٹھے ہوئے پان چباتے ہوئے چنوں میاں غصے میں کہتے۔

''اے سچ ماتحت بنا کے رکھیں گے کیا۔ میاں چوڑیاں نہیں پہنی ہیں، ان ہاتھوں میں۔''

وہ ہاتھ نچاتے۔ ''فولادی ہاتھ ہیں میاں فولادی۔''

''لو ان کی سنو۔''

انیسو دل کھول کر ہنستا پھر ایک ساتھ سب قہقہہ مارتے، جس کی داڑھی بن رہی ہوتی، بال کٹ رہے ہوتے، وہ ناراض ہوتا۔

''دیر ہو رہی ہے جلدی کرو۔''

تھوڑی دیر کے لیے ''انجمن'' جیسے خاموش ہو جاتی۔



●●

اور اس انجمن میں تھا ہی کیا؟ اٹھائی گیروں اور موالیوں کی انجمن بھی کیا؟ انجمن تو ہوتی ہے بڑے لوگوں کی۔ باتیں بنانے کا حق تو بڑے لوگ رکھتے ہیں۔ چھوٹے لوگوں کے پاس تو یہ حق بھی نہیں۔ بس اڑتی اڑتی خبروں کا اپنی سطح پر تبصرہ کرنا اور سوچنا۔ ذہن کی سطح اگر زیادہ پرواز کرتی تو دلی کی جامع مسجد سے ٹکراتی یا سید شہاب الدین اور مولانا بخاری کے تذکرے بھی آ جاتے۔ یہاں 'نئی دنیا' اور 'اخبار نو' جیسے پرچے خوب پڑھے جاتے۔ چنوں میاں جیسے لوگ ان سدابہار خبروں کو چٹخارے لے لے کر سنانے کو تیار رہتے۔

وہ ایک خبر پڑھتے اور 'محفل' تاؤ کھا جاتی۔ نوجوان غصے میں آ جاتے۔ بڑے بوڑھوں کے ماتھوں پر بل پڑ جاتے، مٹھیاں بھینچ جاتیں۔

— ''سنا اسرائیل خانہ کعبہ پر بم گرانے والا ہے۔

— مکہ معظّمہ سلگ رہا ہے۔

— امریکہ پھر عراق کو تہہ تیغ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

اشوک سنگھل اور اڈوانی کا ارادہ ہندوستان کی باقی مسجدوں کو بھی ڈھا دینا ہے۔''

— ''اوما بھارتی کے کیسٹ میں ہے کہ بابر کی اولادوں کو بھارت چھوڑنا ہوگا۔

— ''اورنگ زیب نے بنارس اور متھرا کے مندروں میں دیپ جلائے تھے۔''

''بھولا میاں کے یہاں لڑکا ہوا۔ لڑکے کا نام صدام رکھا گیا۔''

''مکہ معظّمہ تو میکسیکا کا مندر ہے۔ وہاں شیولنگ رکھا ہوا ہے، ایسا کہتے ہیں وہ بھونسری......''

— ارے گرونانک جی تک وہاں نہیں جا سکے کیونکہ مسلمانوں کے علاوہ وہاں

کوئی جا ہی نہیں سکتا۔''

— ''لیکن وہ گئے تھے۔''

— ''یہ کیسے ہوسکتا ہے، اگر گئے ہوں گے تو مسلمان بن کر۔''

— ''سنا ہے کہ وہ مسلمان......؟''

''سکھوں کا ماننا ہے کہ جب تک ایک بھی مسلمان زندہ ہے، وہ داڑھی اور بال نہیں منڈوائیں گے۔''

''اب تو سکھ مسلمان سے مل گئے ہیں۔اس لیے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔''

— ''اور نئی دنیا کیا لکھتا ہے بھائی۔''

نوجوان لڑکے رفیع بھائی پر جھک جاتے۔چنٹو میاں اور رفیع بھائی دیر تک نئی دنیا کا خلاصہ پلاتے رہے۔اسلم جب گھر لوٹتا تو یہی باتیں دیر تک اس کے دماغ میں بجتی رہتیں۔کوئی دیر تک وحشی سر میں اس کے کانوں میں چیختا رہتا۔

''اسلم کچھ نہیں ملنے کا تمہیں۔کچھ نہیں ملنے والا۔آخ تھو، تھو ہے تم پر، نہ کام نہ دھندا۔باپ نے پڑھایا ہوتا تو کسی چھوٹے موٹے روزگار کے بارے میں بھی سوچتا، پر۔؟ مسلمان ہیں تو سارے راستے بند ہیں۔ہاتھ کٹ گئے ہیں تیرے۔تیرا ختنہ ہو چکا ہے۔نہیں۔وہ جو کہتے ہیں پورا چھو چھوڑ ہی کٹ گیا، پورا چھو چھو۔''

اس کی آنکھوں کے آگے ڈھیر سارے میزائل چھوٹ رہے ہیں۔اسے ایسا لگتا ہے جیسے کسی دکان پر بیٹھ کر، ہندستان پاکستان کی جنگ کو لے کر اس نے پاکستان کی وکالت کر دی ہو۔اور......

اس کا سارا بدن پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔



## (۲)

رات میں بارش ہوئی تھی، ٹپ ٹپ۔دیر تک...... اماں کا دردناک الاپ، کروٹ بدلتی مہرن اور ابا کے فکر مند چہرے کے سوا تھا ہی کیا؟ ٹپ ٹپ بارش۔وہ دیکھتا ہے۔ابا اسے دیکھ کر غصے سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ٹپ ٹپ...... چھجے سے ہو کر پانی ابا کے زمین پر بچھے کمبل پر گرتا ہے۔

عبدل کچھ دیر تک خاموش رہتے ہیں۔ناک کی سیدھ میں گرتی ہوئی پانی کی بوندوں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ٹپ ٹپ......کمبل گیلا ہو رہا ہے۔عبدل دیکھتے رہتے ہیں۔

پھر تھوڑا سا کمبل موڑتے ہیں۔کان پر رکھی بیڑی نکالتے ہیں۔ماچس جلاتے ہیں۔وہ ابا کے فکر مند چہرے سے اٹھتے ہوئے بھاپ کو دیکھتا ہے۔

پلنگڑی پر لیٹی ہوئی مشتری کا ٹیپ چالو ہوتا ہے۔''اشرفو۔ارے اشرفو۔''

''سالا لفنگا۔''

عبدل کی بیڑی بجھ گئی ہے۔پانی کی بوند 'ٹپ' سے گری ہے ناک پر۔ناک سے ہوتے ہوئے بیڑی کے جلتے منہ پر— بیڑی بجھ گئی۔اسلموا دیکھتا ہے۔دوبارہ

ماچس کی تیلی جلی ہے۔عبدل کے چہرے پر فکر کی لکیریں اور گہری ہوگئی ہیں۔اسے لگتا
ہے اندر ہزاروں چیونٹیاں داخل ہوگئی ہیں جو اسے کاٹے جارہی ہیں۔

ڈھیر ساری چیونٹیاں۔

ہزاروں لاکھوں چیونٹیاں۔

جو کاٹ بھی رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔سنو۔تمہارا ختنہ ہوگیا ہے۔کٹ گیا ہے
پورا کا پورا چھوچھو۔'

جیسے ٹیپ کی سوئی کہیں اٹک گئی ہو۔

......بس ایک ہی مکالمہ۔

''سنو تمہارا چھوچھو۔''

دو ایک سال قبل ابا کا مشک پہلی بار باندھ کر وہ روزگار کی تلاش میں خاک
چھاننے نکلا تھا۔مگر کیا ملا تھا سوائے مصیبت مول لینے کے۔

چودھری صاحب تک نے ٹوکا تھا۔''میاں صاحبزادے۔عبدل کا زمانہ لد گیا۔
کوئی نیا پیشہ اختیار کرو۔اسی میں بھلائی ہے۔''

''نیا پیشہ؟''

اسے لگا اس کے منہ پر تھوک دیا گیا ہے——لفنگا موالی، نیا پیشہ......

پانی کی ٹپ ٹپ جاری ہے۔ابا کی بیڑی بجھنے کو ہے۔عبدل مشتری کے دروازہ
تک جا کر ٹھہرتا ہے، جیسے دیکھ رہا ہو بڑھیا کی سانس چل رہی ہے کہ نہیں۔بڑھیا مر تو
نہیں گئی؟ عبدل نے بیڑی بجھادی ہے۔پاؤں سمیٹ کر، کمبل کو موڑ کر بیٹھ گیا ہے۔

اسلم دھیرے سے اٹھ کر ابا کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔

''ا......ب......با''



''کیا؟''

''وہ آپ نے چودھری صاحب سے بات کی؟''

''بات۔کس کے لیے؟''

''میرے لیے؟ میرے دھندے کے لیے؟''

''کیوں؟ تو کیا دھندا کرے گا؟''

عبدل کے الفاظ سیدھے اس کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

''اس میں برائی کیا ہے ابا؟''

''تو کرے گا یہ برائی ہے۔جا سو جا۔''

عبدل کمبل کو موڑ کر اوندھا لیٹ گیا ہے۔چھجے سے ٹپک کر پانی بھی کمبل کو بھگوئے
جارہا ہے۔ٹپ ٹپ۔پتہ نہیں رات کتنی گزر چکی ہے۔بارش کی رات میں تو کمبخت کتے
بھی نہیں بھونکتے۔

کتے کا بھونکنا اسے کبھی برا نہیں لگا جب گلی کوچے کے کتے بھونکتے ہیں تو اسے لگتا
ہے ڈھیر سارے بھوت سنسان ویران گلیوں میں نکل آئے ہوں۔وہ ان ساری گلیوں
کو ناپ رہے ہیں۔اور ان کے پیچھے کتے لگے ہوں۔ڈھیر سارے کتے۔

اور کتے لگاتار بھونک رہے ہوں۔مسلسل بھونکتے جارہے ہوں۔اسے لگتا ہے
اتنی ڈھیر ساری بھونکنے کی آوازوں میں اس کی اپنی آواز بھی شامل ہوگئی ہو—— گلی
کوچے کا کتا۔

اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور بارش ہونے کے باوجود گلی والا دروازہ
کھول کر باہر نکل گیا۔

## (۳)

صبح ہوتے ہی شہر ایک دم جاگنے سا کیوں لگتا ہے؟

ہنگامہ، شوروغل۔ جیسے کبھی ویرانی سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔ ہزاروں دوڑتی گاڑیاں سواریاں، رکشے، ٹیمپو اور بے شمار انسانی قافلوں کے قدم۔ سب ایسے شہر کو روندتے ہیں جیسے شہر نہ ہو سستے داموں میں بکنے والی طوائف ہو۔ پھر شہر جیسے ہی شب کا کفن اوڑھتا ہے تو جیسے ایک ماتمی دھن سڑکوں پر گونج جاتی ہے......

......وہ انسانی قدموں کے قافلے۔

......وہ شور وہ ہنگامہ۔

......یہ وہ سڑک تو نہیں......؟

......اور اگر یہی شہر بارش میں نہا جائے تو؟ تیز بارش میں......اسلم گھر سے باہر نکلا مگر ایک حسرت رہ گئی۔ کتے بھونکتے تو آواز میں آواز وہ بھی ملاتا، مگر یہ کتے کہاں سو گئے کمبخت؟ دبکے ہوں گے نالیوں میں، چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں میں، سالے سب کے سب کتے۔

بارش دھیمی ہو چکی تھی۔ بارش کی بوندوں سے سر کے بال تھوڑے سے بھیگے



تھے۔ پیر چپچپا گئے تھے۔

ٹوٹی ہوئی پیوند لگی ''چپّی'' آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ دماغ بوجھل ہو تو بارش میں بھی مزہ آتا ہے، بھیگتے رہو دیر تک۔

تک......دھنا دھن تک......

تک......دھنا دھن تک

اس کا جی چاہا۔ اندھیرے میں تھوڑا سا 'تھرکا' جائے۔ تھوڑا سا ناچ لیا جائے۔

دن کے اندھیرے میں تو یہ بدن صرف 'نوچتا' ہی رہتا ہے۔ ڈستا رہتا ہے۔ وہ تھوڑا تھرکنے بھی لگا لیکن احساس ہوا، اندر کی بے چینی ذرا اور بڑھ چلی ہے——ابا کی نظر میں وہ ''لاخیرا'' ہے۔ بے اوقات، اٹھائی گیرہ اور اس سے زیادہ کیا ہے؟

سڑک پر ایک ٹن کا ڈبہ پڑا تھا، اس کی طرح لاوارث۔ اس نے ڈبے کو ٹھوکر لگائی، کھٹاچ......ڈبہ دوسری طرف منگرو کے ٹھیلے سے ٹکرایا۔

منگرو کے ٹھیلے کے پاس ہی جینو میاں کا گھر تھا۔ جینو میاں یعنی زین العابدین۔ جینو چا ہر فن مولا تھا۔ خاص کر محرم میں تو ان کا گدکا بھانجنا مشہور تھا۔ کہتے ہیں دس دس کوس سے ان کے گدکے بھانجنے، کے ہنر کو دیکھنے کے لیے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے ٹوٹ پڑتے تھے۔

اس محلے کے تعزیہ کا نام ہوتا تھا چودھری چک کا تعزیہ——اور جینو میاں اس موقع پر سب کی نگاہوں کے چراغ تھے۔ پہلی محرم سے ہی ان کی کارروائی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ سیاہ کپڑے پہن لیتے، سر سے جیسے دو پلی ٹوپی چپک جاتی اور جب چودھری چک کی تعزیہ اٹھنے سے قبل امام باڑے پر فاتحہ ہوتا، شربت اور مالیدے بانٹے جاتے۔

تب جینو میاں کا رعب اور دبدبہ دیکھنے کے لائق ہوتا۔ نومحرم کو تعزیہ اٹھتا اور آٹھ محرم کی شام سے ہی چودھری چک امام باڑے کے پاس ڈنکا بجنا شروع ہو جاتا۔ اس ڈنکے کی چوٹ کم و بیش اس طرح کی ہوتی۔

چھچھپن ......نا۔نا۔نا...... چھچھپن ......نا۔نا۔نا......

جینو میاں سیاہ کپڑے پہنے، ڈنکا بجانے والے کی جیب میں ایک ایک روپیہ کا نوٹ ٹھونس کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے ہوتے۔

''اور میاں۔ شاباش اور تیز۔''

چھچھپن ۔نا۔نا۔ چھچھپن ۔نا۔نا۔نا۔

اور پوری گلی تعزیہ اٹھنے کے شور سے گلزار ہو جاتی۔

یہ جینو میاں کا ایک رنگ تھا۔

جینو میاں اور بھی کتنے فن کے استاد تھے۔ چار پائی کرسی بنوانی ہو، رکشہ چلانا ہو۔ کہنا چاہئے، تقدیر اور قسمت خود ہی ہزاروں فن سکھا دیتی ہے۔ رکشا چلانا فن نہیں مجبوری تھی ان کی۔ پیٹ کی دوزخ اور اندر سلگتی آگ انسانی چہرے سے اس کے شوق، اس کے فن اور اسی کے ساتھ اس کے چہرے کی چمک کو چھینتی چلی جاتی ہے۔

اور یہی جینو میاں کے ساتھ ہوا۔

ادھر مشک کا رواج کم ہوا اور ادھر جینو میاں کے چہرے کی چمک دن بدن کم ہوتی چلی گئی۔ ہنس مکھ اور ملنسار کہے جانے والے جینو میاں جیسے خود سے ہی چپک گئے۔ پھر کہاں کا محرم اور محرم کے ہنگامے۔

سب جیسے گزرے وقت کا قصہ ٹھہرا۔

ایک پرانی داستان۔

اسلم نے دیکھا، جینو میاں کے گھر لالٹین جل رہی ہے اور دھیمے لہجے میں کوئی



سسک رہا ہے۔

'یا اللہ......'

وہ گھبرا گیا۔

بارش ذرا کم ہو گئی تھی۔

دروازہ اڑگا تھا۔ اسلم نے دروازے کو تھوڑا سا جھٹکا دیا اور آواز لگائی۔

''چچی۔ کیا ہوا ہے؟''

لالٹین سیاہ پڑ چکا تھا۔ کمرے میں سیلن تھی۔ گھر میں تھا ہی کون؟ چچی کہی جانے والی عورت نے سر اٹھایا، آنچل سے آنسو پوچھے۔ اس کی جانب پلٹ کر دیکھا۔

''چچا تو ٹھیک ہیں۔؟''

اسلم نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

جینو میاں چار پائی پر چت پڑے تھے۔ تسلی کے دو بول ملے تو اندھیری بارش کی رات میں چچی اندر کے سیلاب پر قابو نہیں رکھ سکیں، اور سیلاب جذبات کے پل کو توڑتے ہوئے سب کچھ بہا کر لے گیا تھا......

''اب کا پوچھو ہو اسلم۔ آگے تقدیر میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جانے کا لکھن ہیں پروردگار اپنی قسمت میں۔ بڑھاپا تو نگوڑی خوشی خوشی کٹنے کی چیز، اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ہووے ہے۔'' چچی نے اپنے آنسو پوچھے۔ پھر کہا......

''یہاں اپنی تقدیر میں خوشی کا کوئی روز نہیں گزرا۔ کیا نیاز، ملیدہ، پرب تہوار۔ ہماری قسمت میں بارہو مہینہ محرم تھا۔ اور اب یہ جا رہے ہیں۔ دیکھو نا۔ کچھ بولتے نہیں کل سے۔ آج شام تک ٹھیک تھے۔ رات سے طبیعت اور خراب ہوئی۔ چہرہ نہیں دیکھتے ہو اور ایک وہ لڑکی تھی......''

''رجوا...... چھنال...... رنڈی...... کمبخت کی ماری۔ اللہ جہنم میں جلائے دیکھ

لینا۔ وہ دوزخ میں بیٹھ کر پیپ اور آنکھ کی کچی کھائے گی۔ بہت ستایا ہے، اس نے ہمیں۔ کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بے حیا، ذلیل، دیکھ لینا اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے، میری قسمت میں اتنا اندھیرا لکھا ہے تو فیصلہ ضرور کرے گا۔ اللہ۔ پاک پروردگار ان کے حال پر رحم کرے۔ جس دن سے رجوا بھاگی ہے یہ تو اسی دن سے ٹوٹ گئے، دیکھو نا کیسے چپ ہیں۔''

''رجوا کے ابا بولتے کیوں — بولتے کیوں نہیں؟''

اسلم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

چچی کے شانے پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔

''زیادہ درد مت پالو چچی۔ صبر سے کام لو اللہ جو کرے گا......؟

''اب کیا کرے گا۔ آئیں۔ چچی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔

''اللہ میاں دیکھ نہیں رہے ہیں ہماری حالت؟ آئیں۔ بولو سب قصور اللہ میاں کا ہے۔ ہاں انہیں سب پتا رہا ہے۔ کربلا کے پیاسوں کا۔ کیا اللہ میاں کو پتہ نہیں تھا؟ ''یزید کے ظلم کا؟ امام حسن، امام حسین شہید ہو گئے، سکینہ قتل کر دی گئیں۔ اللہ میاں کو سب پتہ رہتا ہے۔ اسلم! سب پتہ رہتا ہے'' چچی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ''اب اللہ میاں کو یہ بھی پتہ ہے کہ ان کے بعد ہم اکیلے ہو جائیں گے؟ بے آسرا ہو جائیں گے۔ تب کون اس بڑھاپے میں ہماری مدد کو آئے گا؟ آئیں۔ بولو؟ کون سہارے دے گا؟ تب دو وقت کی روٹی کون مائی کا بیٹا لا کر ٹھونسے گا؟ ہاتھ پھیلاؤ تو کوئی بھیک بھی نہیں دے گا۔ برقعہ اوڑھ کر دروازے کے باہر بے شرم اور ذلیل ہونے کے لیے نہیں بیٹھیں گے ہم، کہ دنیا آ کر ہم پر تھوکے، حقارت سے دیکھے اور کہے وہ دیکھو جینو میاں کی بیوہ بیٹھی ہے بھیک مانگنے کو۔ سب کی سب بدکار جمراتن جیسی نہیں ہوتیں، جو شوہر کے مرجانے پر جمعہ کے روز برقعہ اوڑھ کر بھیک مانگنے میں شرم نہیں کرتی ہیں اور بھی کیا



کیا کرتی تھی۔ کمبخت نامراد — زمانے خراب ہیں۔ اور وہ کمبخت رجوا کو لے کر ہمیں ذلیل کرتی ہے؟''

چچی کی آنکھیں سیلاب کے سارے باندھ توڑ گئی تھیں۔ ''اللہ میاں کو سب پتہ رہتا ہے۔ ہاں میاں سب پتہ رہتا ہے۔''

ایک بارش باہر تھی اور ایک بارش چچی کی آنکھوں میں تھی۔

چچی کا ٹیپ ابھی تک چالو تھا۔

''اللہ میاں سب جانتے ہیں۔ اللہ میاں کو سب پتہ ہوتا ہے، سب پتہ ہوتا ہے۔''

اسلم کا دل دھک سے ہو گیا۔ اسے لگا، سب طرف لاشیں سجی ہیں۔ لاشیں ہی لاشیں، جو زندہ ہیں وہ بھی کفن اوڑھ کر بیٹھے ہیں۔ چہار سمت لوبان جل رہے ہیں۔ قبرستان میں مرنے والے کے کمرے میں — عبدل ہوں یا جینو میاں۔

دھیرے سے پوچھا۔ ''چچی! علاج کس سے کروا رہی ہو۔''

چچی کا رونا تھوڑا رکا تھا، وہ اس سوال سے جیسے پھر شروع ہو گیا۔

''نگوڑا، ایک وقت کے کھانے کا پیسہ تو جٹتا نہیں، علاج کہاں سے ہو گا۔''

''حمزہ ڈاکٹر تو غریبوں سے پیسے بھی نہیں لیتے۔ بڑے اللہ والے ہیں۔''

''گئی تھی''

''دوا لائیں......''

''انہوں نے صاف بول دیا۔ پیٹ کے دونوں گردے خراب ہیں، اب یہ بچیں گے نہیں۔ چند دنوں کے مہمان ہیں بس سب قسمت کی مار ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے۔'' اسلم بولتے بولتے رہ گئے۔ کمرے کی سیلن چچی کی تڑپتی آواز سے اور بڑھ گئی تھی۔

''اچھا چچی۔ چلتا ہو، سلام علیکم۔''

اسلم نے جینو کے مردہ جیسے چہرے کی جانب ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اپنے قدم پھر سے باہر کی طرف کھینچے۔ پاؤں کی چٹی اب بارش سے اتنی بھیگ چکی تھی کہ بس جواب ہی دینے والی تھی۔

باہر ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ اب بھی جاری تھی۔

یہ شہر اندھیرے میں قبرستان یا شمشان کیوں بن جاتا ہے؟ بھوتاہا، آسیبی — وہ سچ مچ کسی شمشان میں نکل آیا ہے۔ جہاں چاروں طرف مردوں کے گوشت کی بو پھیل چکی ہے۔ چاروں طرف مردے جل رہے ہیں۔

اور انسانی گوشت کے جلنے کی بدبو شمشان سے نکل کر دور دور تک پھیلتی جارہی ہے۔ جینو میاں کے گھر سے اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہونے تک اسلم کے سامنے ایک ہی چہرہ روشن تھا — جینو میاں کا چہرہ۔



## (۴)

ڈیوڑھی (گھر کا باہری حصہ) میں جینو میاں کی میت پڑی تھی۔ دیوڑھی کی خستہ دیواروں سے ٹکرا کر سسکیوں کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ ڈیوڑھی کا تنگ دروازہ آج اڑوس پڑوس کی عورتوں سے بھر گیا تھا، جہاں کبھی جینو میاں بکریاں باندھتے تھے وہاں چنٹو میاں نے اپنے گھر سے لاکر چارپائی بچھادی۔ چارپائی پر کچھ بہت ضعیف قسم کے لوگ بیٹھ گئے تھے۔ رائے مشورہ ہو رہا تھا کہ جنازہ کب اٹھے گا۔

ابو بھائی تانگے والے نے کہا۔ ''جنازہ کو زیادہ دیر تک نہیں رکھنا چاہئے۔''

صبح پانچ بجے کے آس پاس جینو میاں کی موت ہوئی تھی۔ سلامت چچی نے آخری وقت، آخری بار اپنے میاں کی آواز سنی تھی...... وہ بھی آدھی لڑکھڑاتی ٹوٹتی......

''پا......نی......''

ادھر وہ پانی لانے گئی ادھر جینو میاں کی گردن ڈھلک گئی...... ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا جینو میاں نے...... سب سے پہلے سلامت چچی نے روتے بلکتے عبدل کا ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ سلامت چچی کے رونے بلکنے کی آواز سے ہی اسلم سمجھ گیا کہ جینو چاچا نہیں رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے محلے والوں کو خبر ہوگئی۔

محلہ تھا ہی کتنا بڑا۔

زیادہ تر تو یہ بھشتی تھے۔ سقہ...... جن کو آج کے دور میں لوگ نام بگاڑ کر مسک والا کہنے لگے تھے...... سلامت چچی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ پیسہ — جنازہ، کفن، دفن سب کے لیے پیسہ چاہیے۔ یہاں تو آنچل کی گانٹھ میں صرف ایک اٹھنی بندھی تھی۔ سو اٹھنی انہوں نے ڈرتے ڈرتے پنچ کے سامنے رکھ دی۔ زمین اور دیواروں پر ہاتھ مارتے مارتے ہاتھ کی رگیں تک پھٹ گئی تھیں۔

''اب کس کے لیے زندہ ہوں، رجوا کے ابا۔''

''یہ رجوا کہاں ہوگی؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہوگی کہاں؟ ممبئی میں ایکٹرس بن گئی ہوگی، بس۔''

کسی نوجوان نے کہا تو ابو بھائی بگڑ گئے۔

''یہ کوئی وقت ہے مذاق کرنے کا میاں۔ یہاں جینو میاں کی لاش پڑی ہے اور آپ ہیں کہ......''

چنٹو میاں نے دخل دیا۔ ''کونسی ناجائز بات کہی ہے میاں۔ ارے اس ناخلف لڑکی نے ہی تو جینو میاں کی یہ حالت کردی۔ برادری ہی نہیں پورے مسلمانوں کی ناک کٹوادی چھوری نے۔''

''اب جو ہوا سو بھول جاؤ۔'' رفیع میاں تنک کر بولے۔

اور دن ہوتا تو سلامت چچی پردہ سے باہر نہیں نکلتیں۔ جینو میاں ہوں یا رفیع میاں یا عزیز میاں درزی والے۔ ان کے یہاں عورتوں میں سخت پردہ تھا۔ ان کی عورتیں برقعہ لگا کر ہی باہر نکلتی تھیں اور یہ باہر نکلنے کی ضرورت سال میں کبھی کبھی ہی پیش آتی۔

خاص کر عید میلہ یا محرم کے ڈنکوں کو سننے کے لیے، جہاں یہ چھما چھم رنگ برنگے



کپڑوں میں سج سنور کر جاتیں اور تعزیہ پہلام ہونے تک بھیڑ لگائے رہتیں۔ ہاں کبھی کبھی جیسے کسی خاص موقع پر، جب چودھری صاحب جیسے لوگ بلایا کرتے، تب بھی منہ پر انگلیاں رکھے ان عورتوں کی جھجک یا ہچک ختم نہیں ہوتی تھی۔

مگر آج تو مسئلہ ہی دوسرا تھا۔ ادھر میاں نے دنیا سے پردہ اٹھایا، ادھر سلامت چچی کا پردہ غیروں سے ختم ہوا — بھائی عبدل۔ رفیع میاں، ابو بھائی، عزیز، چنٹو میاں۔ پہلے تو جینو میاں سے صرف ان کے تذکرے ہی سنتی تھیں۔ اچھے دن تھے، کوئی آجاتا تو ہاتھ نکال کر ڈیوڑھی میں چائے بڑھا دی جاتی۔ مگر آج تو جیسے پردہ ہی اٹھ گیا تھا۔

چنٹو میاں کی اہلیہ نے اس بے پردگی کا برا مانا۔

''مرنے والے کی بیوی کے لیے چار مہینہ دس دن تک غیر مرد کی صورت بھی دیکھنا حرام ہے بھائی۔''

''پھر کا کروں...... مٹی، منزل کا انتظام کیسے ہوگا۔''

اندر اس مسئلہ پر عورتیں مشورہ کر رہی تھیں اور باہر مرد۔

رات والی بارش پو پھٹتے ہی رک گئی تھی۔

اب آٹھ بجنے کو تھے — بدلی چھٹ چکی تھی — سورج کا گولا آگ برسا رہا تھا۔

''پھر کیا کیا جائے'' ابو بھائی نے پوچھا۔

عبدل نے کہا...... ''بھابی کے پاس تو بس لے دے کر ایک اٹھنی ہے۔''

''اور ہوگا بھی کیا؟'' چنٹو بھائی نے دخل دیا۔ ''ہم مسلمانوں کے یہاں اتنا بھی مل جائے تو غنیمت۔''

''یہ مسلمانوں کا نوحہ یا مرثیہ پڑھنے کا وقت نہیں۔'' محلے کے ایک شخص نے ناراض ہو کر کہا۔

ابو بھائی بولے۔ ''دن چڑھ رہا ہے، لاش کو زیادہ دیر تک رکھنا مناسب نہیں......
غسل دینے اور کفن پہنانے کا کام تو شروع کرنا چاہئے۔ ظہر کی نماز تک مٹی۔ منزل
ہوجانی چاہئے۔''

''لاش دفنائی کہاں جائے گی؟''

کسی نے مشورہ دیا ''بھبلی پور والے لاوارث قبرستان میں۔''

عزیز بھائی بولے۔ ''اس زمین کو لے کر تو مقدمہ چل رہا ہے۔ پچھلے سال ہی تو
بھلبی پور کا تعزیہ ادھر سے لے جانے پر ادھر کے ہندو لاٹھی گنڈاسہ لے کر آ گئے تھے
کہ ادھر پیپل کے پیڑ سے نہیں لے جانے دیں گے۔ یاد ہے تعزیہ لوٹ گیا تھا۔ احتجاج
کے طور پر باقی محلے والوں نے اپنا تعزیہ سیاہ پرچم کے ساتھ امام باڑے پر چھوڑ دیا
اور شہر میں ٹینشن ہو گیا تھا۔''

چنٹو میاں کو پھر چڑھ گئی۔ ''کیسے نہیں یاد ہوگا عزیز بھائی! اور دوسرے دن پیپل
کے پیڑ سے شیو جی کی مورتی نکل آئی تھی اور اتنی جگہ گھیر کر مندر بنا دیا گیا تھا۔ وہ تو ڈی
ایم نے ٹینشن کو دیکھتے ہوئے راتوں رات بنا مندر توڑوا دیا اور اس علاقہ میں دھارا
۱۴۴ لگوا دی۔''

— کسی نے کہا ''ان کا بس چلے تو۔''

— چنٹو میاں دہاڑ اٹھے۔ ''جی مت دکھاؤ بھائی، ان کا بس چلے تو یہ کافر قدم قدم
پر مندر بنوا دیں۔ ایک بابری مسجد کی شہادت سے فائدہ اٹھا کر ساری مسجدیں ہی
ڈھا دیں۔ میرا کیا ہے میں پاکستان جا رہا ہوں۔''

''اچھا۔''

کچھ لوگ چونک پڑے...... ''کب۔''

''اس ماہ کے آخر تک — ویزا بن چکا ہے۔'' چنٹو میاں پھر اصلی بات پر آ گئے۔



''ایک بات کہوں اصلی مسلمان تو یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔'' وہ پل بھر کے لیے
ٹھہرے، جیسے سب کی آنکھوں میں جھانک رہے ہوں۔ سچ مچ سب کی آنکھوں میں
جواب جاننے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔

''اصلی مسلمان یہاں کیوں نہیں ہیں؟''

''یہاں سب کنورٹیڈ Converted ہیں۔ کنورٹیڈ۔'' انہوں نے اپنی
معلومات کی نئی توپ چھوڑی۔

''بھائی یہ کنور......ٹیڈ......کیا ہوتا ہے؟ کچھ لوگ اس لفظ کو لے کر گڑبڑا گئے۔
چنٹو میاں دل ہی دل میں مسکرائے۔ ''ہندستان کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔'' وہ پھر
مسکرائے......

''مسلمان یہاں کیسے اور کس طرح آئے، وہ جیسے بھی آئے ہوں پر ڈھیرے
ڈھیرے ہندوؤں کے اثر میں آ گئے۔ یہاں دیوی دیوتا تھے، ان کی پوجا ہوتی تھی۔
نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہاں بھی قبروں پر جانا اور اس طرح کی دوسری بدعت شروع
ہو گئی۔'' انہوں نے جیسے تال ٹھوکا۔ ''ارے ہم مسلمان رہے کہاں؟'' ''مسلمان ہوتے
تو آج جہاد پر نکل گئے ہوتے، دیکھ لینا اگر حالات کے یہی رنگ رہے تو ہندوستان
سے تو اسلام گیا ہی سمجھو — میرا کیا ہے۔ میں تو پاکستان جا رہا ہوں......''

●●

اچانک بات چیت کے اس نئے موڑ سے لوگوں نے سنجیدگی کا لبادہ اختیار کر لیا
تھا۔ رفیع میاں نے بات آگے بڑھائی۔ ''بات تمہارے پاکستان جانے کی نہیں ہے،
جینو میاں کے مٹی منزل کی ہے۔''

خاموشی کا ماحول ٹوٹا اور جیسے سب یکا یک جینو میاں پر آ گئے۔

''بھابی بھی کے پاس توصرف اٹھنی بچی ہے۔''

اندر عورتیں سلامت چچی سے پوچھ رہی تھیں۔ ''یہ رونے کا وقت نہیں ہے بھابھی......اللہ کومنظور تھاوہ ہو چکا ہے لاش کو زیادہ دیر تک رکھا جائے تو......''

''لاش......لاش......'' روتے روتے سلامت چچی کے لفظ جیسے بارود بن گئے۔

''اندر باہر ہر طرف یہی سن رہی ہوں کہ لاش کو زیادہ دیر تک رکھا جائے تو لاش بدبو دینے لگتی ہے— تمہیں صرف انہیں کی بدبو محسوس ہو رہی ہے؟ آئیں؟ اور یہاں برسوں سے ان زندہ لاشوں سے جو بدبو اٹھ رہی ہے وہ تم سب کو کبھی محسوس نہیں ہوتی؟ ارے پیسہ نہیں ہے یا محلہ والے مل کر جمع نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو ان کی لاش کو......گھر جاؤ......ہاں جان لو— چیل کوؤں اور گدھوں کی غذا نہیں بننے دوں گی۔اتنی طاقت آ گئی ہے کہ کسی کی محتاج نہیں بنوں گی۔خود لے جاؤں گی انہیں قبرستان میں۔خود ہی قبر کھودوں گی اور دفنا کر آؤں گی۔ہاں کسی کی محتاج نہیں بنوں گی۔''

لفظ جیسے سچ مچ بارود ہو گئے تھے۔سب یکا یک سن رہ گئے۔سلامت چچی کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔عورتوں کو لگا جیسے کاٹھ مار گیا ہو۔

رفیع بہو کو لگا جیسے اندر خون کی گردش تیز ہو گئی ہے۔یہاں اس پورے محلے میں بھلا سلامت چچی کی اس حقیقت بیانی سے کون انکار کر سکتا تھا۔کون زندہ تھا یہاں؟ جیتے جی کس کے جسم سے بو نہیں آ رہی تھی۔

مرنے کے بعد کیا بو آئے گی—

یہی سلامت چچی تھیں جب رجوا بھاگی تھی تب کیسی کمزور ہو رہی تھیں، کیسی کیسی ذلتیں پی رہی تھیں زمانے والوں کی؟

●●



رجوا— آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ منظر زندہ تھا۔

بچپن سے ہی رجوا بگڑی ہوئی تھی یا کہنا چاہئے کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے لاڈ پیار میں بگڑ گئی تھی۔صورت دیکھنے میں اچھی خاصی تھی۔اس لیے بچپن سے ہی سجنے سنورنے کا شوق کچھ زیادہ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ذرا بڑی ہوئی تو جینو میاں کے جیب سے پیسے بھی چرائے جانے لگے۔یہ پیسے لپسٹک، پاؤڈر، کریم وغیرہ میں خرچ ہوتے۔

کہتے ہیں کہ محلے کے کئی نوجوان لڑکوں کو خراب کرنے میں اسی رجوا کا ہاتھ تھا۔ رجوا پاؤڈر کریم لگا کر دروازہ پر کھڑی ہو جاتی اور آتے جاتے لونڈوں کو لائن دیتی رہتی۔پھر ایک دن محلے کے ہی لونڈے سمیع کے ساتھ بھاگ گئی۔کہنے والے کہتے ہیں کہ ہیروئن بننے ممبئی بھاگ گئی......کچھ کہتے تھے کہ سمیع نے اس کو کسی کوٹھے پر بیچ دیا۔جس دن رجوا کے بھاگنے کی خبر عام ہوئی، اس دن جینو میاں کے گھر محلے والوں کا مجمع لگا تھا۔جینو میاں پلنگڑی پر بیٹھے رو رہے تھے۔محلے کی عورتیں سلامت چچی کو خدا واسطے کا کوسنا دے رہی تھیں۔سلامت چچی پہلے تو سنتی رہیں، پھر دھماکے کی طرح پھٹ گئی تھیں۔

''پیٹ میں انسان پل رہا ہے یا حیوان پہلے سے تو خبر نہیں ملتی نا۔مل جاتی تب تو قصوروار تھی نا؟ معلوم ہوتا تو اس جونک کو خون پینے سے پہلے نہ جلا دیتی۔جاؤ تم لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ......بہت کرو گے تو یہی کرو گے نا کہ رجوا کی سزا ہمیں دو گے۔ ناطے توڑ لوگے، تیوہار میں نہیں آؤ گے— تیوہار اور خوشی کیسی اب؟ اب تو دکھ ہی دکھ بھرے ہیں؟ مرنے پر بھی کندھا دینے مت آنا۔لاوارثوں کے مردے بھی گھر میں پڑے نہیں رہتے، جنازے کو کندھا مل ہی جاتا ہے۔''

وہ پھر زور سے چیخیں 'جاؤ سب لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ۔'

اس دن لوگ چلے گئے......سلامت چچی پر رحم بھی آ گیا۔ بیچارے جینو میاں
کے جھکے کندھے زخم دینے لگے تھے۔ لوگوں کو افسوس آیا۔ رجو بھاگ گئی تو اس میں
جینو میاں کا قصور کیا ہے۔ لیکن جینو میاں کو لگا تھا، ان کا قصور ہے۔ لڑکی ہاتھ سے نکلی
جا رہی تھی اور ان کا دھندہ ختم تھا۔ سقہ کا پیشہ اختیار کرنے والے بیکار ہو گئے تھے۔
رجو کی شادی کیسے ہوتی؟

••

سلامت چچی کے سخت الفاظ نے ایک بار پھر ان پرانے دنوں کی یاد تازہ کر دی
تھی......''میاں کی لاش کو چیل، کوؤں کی خوراک نہیں بننے دوں گی۔''
''چاندی کا کوئی زیور تو ہوگا؟'' شبراتی نے پوچھا۔
پل بھر میں سلامت چچی کی آنکھوں میں، نکاح میں جوڑے گئے سامان یاد
آ گئے۔ ابا نے کہا تھا — لڑکا ہونہار ہے، سنتے ہیں پان کھانے کا بھی شوقین ہے۔
بڑی مشکل سے ابا نے چاندی کا طشت، پان ڈبہ، عطر رکھنے والی چاندی کی مچھلی وغیرہ
بہت سے سامان منگوائے تھے۔ لیکن ڈھیر سارے سامان تو برے وقتوں کے کام
آ گئے۔ چاندی، تانبے کے سارے برتن بک گئے۔ محلے کے دوسرے سقے تو بیکار
ہو گئے مگر جینو میاں کی نظر میں کوئی کام برا نہ تھا۔ بہت دنوں تک تو عزیز بھائی درزی
والے اور ان کے پڑوس والی دکان کی سڑک پر چلچلاتی دھوپ میں پانی پٹانے کا کام
انہیں مل گیا تھا۔ لیکن یہ کام بھی بس گرمی تک کے لیے تھا۔ پھر انہیں کون پوچھتا۔ خالی
وقت میں یہ گھر گھر جا کر آواز لگاتے کہ چارپائی کرسی وغیرہ ''بنی'' تو نہیں ہے۔ آمدنی
پھر بھی نہیں بڑھی تو رکشا چلانے لگے۔ جلد ہی منہ سے خون آنے لگا۔ ڈاکٹر حمزہ نے
بتایا کہ ٹی بی ہوگئی ہے — اب زیادہ دن تک بچنا مشکل ہے۔ سلامت چچی کی



آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

••

ڈیوڑھی میں جینو میاں کی میت پڑی ہے۔
عبدل کی آنکھوں کے آگے دھندلے سے ڈراؤنے خاکے ابھرنے لگے، جیسے
سب کا یہی حشر ہونے والا ہے۔
نبی کریم یاد دلاتا ہے کہ ایک بار چاچا نے ہمیں یونین بنانے کا مشورہ دیا تھا۔
''ہاں یاد ہے۔''
کچھ لوگ جیسے سنہری دنوں میں ڈوب گئے۔ تب دھندہ ٹھیک ٹھاک چل پڑا تھا،
مگر سقوں کی مزدوری ماری جا رہی تھی۔ جینو میاں کو فیکٹری میں کام کرنے والے کسی
ورکر سے یونین لفظ کا پتہ چلا تھا۔ تب اندر جوش زیادہ ہی تھا۔
جینو میاں اکڑ کر بولے تھے۔ ''بھائی اب اتنے پیسے میں گزارہ نہیں چلنے
والا......ہماری بھی یونین ہونی چاہئے۔''
''یونین؟''
''چونکئے مت! یونین کا مطلب ہے مالک لوگ ہمیں کم پگار نہیں دے سکتے۔ کم
دیں گے تو کام بند۔''
جمیلو نے کہا۔ ''کام بند کر دیں گے لیکن پیسے نہیں بڑھائیں گے۔''
''کیوں؟''
''کیونکہ زمانہ بدل رہا ہے جینو میاں! علی بھائی نے قریب آ کر سمجھایا تھا۔ یونین
ان مزدوروں کی بنتی ہے جن کے کام کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ جن کے بغیر مالک لوگ بے
یارو مددگار ہو جاتے ہیں، گھروں میں ٹیوب ویل لگ رہے ہیں — جتنی آمدنی ہو رہی
ہے اتنی غنیمت سمجھو۔ سمجھو اب یہ بھی چھن جانے والی ہے۔ سوچو اگر یہ بھی چھن گئی تو

آگے کیا کرو گے؟ یہ ہاتھ صرف مشک کی موٹھ پکڑنا جانتے ہیں—— دوسرا پیشہ کس طرح اپنائیں گے۔ آئیں؟'' جینو میاں کا چہرہ ایک دم سے خوفزدہ ہو گیا۔

''سوچو اس مسئلے پر سوچنا ضروری ہے۔''

علی بھائی سب کو سکتے میں چھوڑ کر چلے گئے...... سب کے سب جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

وقت نکلا جا رہا تھا۔

سورج کا گولا تپش دینے لگا تھا۔ عزیز بھائی درزی والے نے لنگی کی گانٹھ سے سو روپیہ کا کرارا نوٹ نکال کر ابو بھائی کی طرف بڑھایا۔

''ابو بھائی تجہیز و تکفین کے لیے یہ پکڑیے۔ مرحوم کے لیے کفن کا اچھا کپڑا لیجئے گا۔''

''لاش دفن کہاں ہوگی؟''

''مومن قبرستان میں...... میں وہاں کے سکریٹری سے ابھی بات کر کے آتا ہوں۔ آپ آخری منزل کا انتظام کرائیے۔''

اتنا کہہ کر عزیز بھائی تیزی سے باہر نکل گئے۔

●●

قبرستان میں گہری خاموشی ہے۔ جہاں عبدل بیٹھے ہیں وہاں مٹی کی اونچی سی قبر اٹھ گئی ہے۔ لوگ اپنے گھر جا چکے ہیں لیکن عبدل سناٹے میں آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔

یہ کیسا سچ ہے۔ یہ کیسا انکشاف ہے۔ یہ کیسی حقیقت ہے؟

لگتا ہے موت کے پنجے اس کی طرف بھی بڑھتے آ رہے ہیں۔ جیسے اچانک لہراتے ہیں بادل—— گھٹا چھا جاتی ہے—— مینہ امڈ کر آتے ہیں۔ ویسے ہی موت کا پنجہ



دھیرے دھیرے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آنکھوں میں جوان ہوتی مہرن ایک دم سے ناچ جاتی ہے۔ محسوس ہوا، ڈنکے بج رہے ہیں زور زور سے۔

کوئی چیخ کر کہہ رہا ہو...... مہرن بھاگ گئی۔

چہرہ آڑی ترچھی لکیروں سے بھر گیا ہے۔

جینو قبر میں سو رہے ہیں۔

قبرستان کے دوسری طرف آوارہ سور گھوم رہے ہیں۔ ادھر ادھر...... عجب سا سکون ہے۔ انہیں لگا، جینو اچانک کہیں سے نکل کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے ہوں۔

''سنو!''

وہ جیسے خواب سے جاگا ہو۔

......''سنو دلی چلتے ہیں'' آواز لڑکھڑاتی ہے۔ کانپتی ہے۔

......سن رہے ہو، دلی چلتے ہیں، دلی میں اب بھی سقوں کا پیشہ مرا نہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا جامع مسجد، مینا بازار، چاندنی چوک، نظام الدین اولیاء کے مزار پر۔ مشک لے کر سقے گھومتے رہتے ہیں۔ داتا کی چوکھٹ دھلوا لو ثواب ملے گا۔'' جامع مسجد کی سڑھیاں، داتا کی چوکھٹ...... عقیدت مند، دوسرے ملکوں سے آئے سیاح، غیر ملکوں سے آنے والے اچھے خاصے دام دے جاتے ہیں۔ سن رہے ہو، ادھر ایک مشک خالی ہوا ادھر عقیدت مند گاہک پھر تیار۔ ہم مشک والے دوسرے دھندوں میں جائیں تو لوگ ٹکنے نہیں دیتے۔ چلو دلی چلتے ہیں مگر—— آواز لڑکھڑا گئی۔ دلی تو دور ہے—— بہت دور......

''ہاں دلی تو بہت دور ہے جینو میاں۔'' عبدل کو لگا...... وہ رو پڑے گا اور جہاں تم گئے ہو وہ جگہ تو اور بھی دور ہے۔ دور بہت دور۔ دلی سے تو پھر بھی لوٹ کر آ سکتے ہیں

مگر جہاں تم گئے ہو......''

عبدل نے کان میں ٹیکی ہوئی بیڑی نکالی۔ تہہ بند کی گانٹھ سے ماچس نکال کر سلگایا۔ جدھر سے آیا تھا اسی طرف لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وقت کا کہرا ذرا سا چھٹا مگر یہ کہرا تبدیلیوں کی ایک نئی داستان بھی لے آیا تھا۔ ایک دن سلامت چچی نظر نہیں آئیں۔ گھر ٹوٹ کر بننے لگا...... معلوم ہوا سلامت چچی نے وہ زمین کسی ساہوکار کے ہاتھ بیچ دی۔ اور ایک دن محلے والوں کو بغیر بتائے کہیں نکل گئیں۔ کہاں؟ کوئی نہیں جانتا، ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو، جن محلے والوں نے رجوا کے بھاگنے پر انہیں اور جینو میاں کو اس طرح ذلیل کیا ہو...... وہ بھلا شوہر کے انتقال کے بعد انہیں کیا سہارا دیں گے۔ پیسوں کا دوسرا کوئی ذریعہ تو تھا نہیں، اس لیے مکان بیچ کر ایک دن محلے سے جو غائب ہوئیں تو پھر نظر نہیں آئیں۔

دھیرے دھیرے جینو میاں سلامت چچی اور رجوا کے قصے باسی ہونے لگے۔

ایک اور حادثہ ہوا کہ چنٹو میاں پاکستان چلے گئے۔ وہ تو برسوں سے پاکستان جانے کا ''من'' بنائے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی کو عجیب نہیں لگا۔ ہاں، کچھ لوگوں کو یہ صدمہ ضرور تھا کہ چنٹو میاں انہیں بہت کام کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ''نئی دنیا'' اور ''اخبار نو'' کی چٹخارے دار خبروں کو زور زور سے پڑھ کر سنانے والا یہاں سے چلا گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی یاد باقی رہ گئی تھی۔ ایک دن چپکے سے رفیع میاں بھی اٹھ گئے۔ ان کو پرانے دمہ کا مرض تھا۔ محلے کی رونق کم ہو گئی۔ انیسو کے سیلون پر بھیڑ کم ہو گئی۔ محرم اور دیگر تیوہاروں میں بھی اداسی سی آنے لگی۔

لوگ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے اور سوچتے کہ یکا یک سب کچھ کیسے بدل گیا یا سب کچھ یکا یک ہی بدلتا ہے......



## (۵)

مرغ نے بانگ دیا......

عبدل اٹھ گیا۔ اٹھ کر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ ابھی صبح ٹھیک سے ہوئی نہیں تھی۔ ادھر ادھر کا چکر لگا کر جب لوٹا تو کمانی چائے کی دوکان کے پاس اکا دکا لوگ نظر آنے لگے تھے۔ سامنے مولوی ہاشم نظر آئے تو عبد نے سلام کیا۔

''سلام علیکم''

''وعلیکم سلام''، ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

''سنو عبدل! باہر سے جماعت آئی ہے، دس بجے مسجد میں تم بھی آ جاؤ اور تم ہاں! یہ لو......'' انہوں نے پانچ روپیہ کا ادھ میلا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رکھ لو — باہر کے مہمان ہیں۔ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دینا اور ہاں شرفو کہاں ہے؟''

''جی......'' وہ...... عبدل کہتے کہتے اٹک گیا۔

''او ہاں یہ بھول ہی گیا۔ چار دن پہلے افیم لے جاتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ تمہیں تو خبر ہو گی۔ اب جیل میں ہو گا۔ کمال ہے بھائی۔ تم اتنے شریف، ایماندار اور وہ۔

''چھوڑ دیئے ہاشم بابو'' عبدل کا گلا نفرت سے بھر آیا۔

''ہاں چھوڑ، لیکن اسلم کو بھی مسجد میں لے آنا، ایسے لوگ بار بار آتے کہاں ہیں۔ تھوڑی کمائی بھی ہو جائے گی تمہاری۔''

''ضرور لے آؤنگا۔''

عبدل خوش ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی پانچ روپیہ کے دیدار ہو گئے تھے۔ یہ بڑی بات تھی۔ گھر آیا تو مہرن چائے بنا چکی تھی۔

''لیجئے ابا۔''

''اسلم کہاں ہے؟''

''وہ پاس ہی گئے ہیں—ابھی آتے ہی ہوں گے۔''

اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ''اماں کی طبیعت؟''

''ٹھیک ہے۔''

عبدل گرم چائے کی چسکیاں لینے لگا، پھر مہرن سے بولا۔ ''مشک لا کر دے، مسجد جانا ہے اور ہاں، اسلم آ جائے تو دس بجے تک اسے بھی مسجد بھیج دینا۔'' چائے پی کر، مشک کمر کی پیٹی سے باندھ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

●●

دس بجے تک دالان ولی مسجد میں باہر سے آئے مہمان آ چکے تھے۔ یہ قافلہ بیس لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان میں کچھ لوگ انڈونیشیا سے آئے تھے۔ کچھ دلی اور آس پاس کے علاقہ سے۔ یہ تبلیغی جماعت کے لوگ تھے۔ ان کے کپڑے سفید براق تھے۔ چہرے سے نور جھلکتا تھا۔ عبدل اور اسلم بھی صحن میں ایک طرف بیٹھ گئے۔

ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ عبدل نے صحن کو پانی سے کافی دیر تک دھویا تھا—اس لیے فرش سے اب تک بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی۔



لوگ سروں پر ٹوپیاں رکھے تعظیم اور ادب سے بیٹھے تھے۔ اسلم کو لگ رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں اب تک ہزاروں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

سلامت چچی کے وہ الفاظ اس نے بھی سنے تھے۔ ''تمہیں تو صرف مردوں کے بدن سے اٹھتی بدبو محسوس ہوتی ہے۔ ہم زندوں کے جسم سے اٹھنے والی بو تم کیوں نہیں سونگھتے۔'' اسے لگا، اسے یہ سب نہیں سوچنا چاہئے۔

''وہ لاخیرا ہے اور ناکارا۔ بس یہی اس کی سچائی ہے اس سے زیادہ نہیں۔''

امیر جماعت نے مسکرا کر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی ان کی۔ وہ بولے۔

''مذہبی معلومات کی کمی نے ہمیں ٹکڑے ٹکڑے تقسیم کر رکھا ہے۔'' وہ بار بار مسکراتے تھے۔ آپ انہیں چاہے غصہ دلائیں لیکن وہ مسکراہٹ کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔

امیر جماعت اصل موضوع پر آئے۔ ''مذہب پر آج زیادہ سختی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ نماز کی پابندی ہمیں جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ ہم دنیا کے سارے بڑے کام کر سکتے ہیں، لیکن نماز پڑھنے میں ہمیں سستی لگتی ہے۔ ہم نماز سے بھاگتے ہیں۔ نماز ایک ذریعہ ہے، ڈسپلن ہے۔ ہم نوکریوں کے لیے، مدد کے لیے کسی نیتا، ایم پی کے دروازے کھٹکھٹا سکتے ہیں لیکن اللہ کے حضور میں جانے سے خوف کھاتے ہیں، اس سے بھاگتے ہیں......

''..........''

''ہمیں اپنے بچوں کے روزگار کی فکر ہوتی ہے تو ہم درگاہ پر جاتے ہیں...... ہمیں جو نہیں کرنا چاہئے وہ تو کر لیتے ہیں...... لیکن...... جب مانگنا ہے تو اس سے کیوں نہیں مانگیں جو پروردگار عالم ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر مسلمان نماز اور دیگر ارکان کی پیروی

کرنے لگیں گے......''

وہ پھر ایک بار مسکرائے۔ ''سارے مسئلے تب خود ہی ختم ہو جائیں گے۔''

''نہیں یہ ختم نہیں ہونگے۔''

لوگ چونک گئے۔ اسلم نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ تھوڑی داڑھی بڑھی ہوئی، جینس کی پینٹ پر ایک پیاری سے شرٹ پہنے، عمر یہی کوئی پچیس چھبیس کے آس پاس، چہرے پر عجب سا اعتماد پھیلا ہوا تھا۔

''کون ہو تم؟''

''باتیں سننے دو۔''

''پتہ نہیں کہاں، کہاں سے چلے آتے ہیں۔''

''ان نوجوانوں کا تو آج کل دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

امیر جماعت نے مسکرا کر لڑکے کے خلاف بولنے والوں کو منع کیا۔ ''پوچھنے دیجئے۔ یاد رکھیے کہ انسان کو عقیدہ پر لانے والی پہلی منزل انکار کی ہوتی ہے۔ ذرا کلمہ پڑھئے **لا الہ الا اللہ** نہیں ہے کوئی معبود، سوائے اللہ کے۔ کلمہ بھی شروع ہوتا ہے تو لا سے، یعنی نہیں سے۔ ابھی یہ عمر کی جس منزل پر کھڑا ہے اور اپنے چاروں طرف جو گمراہیاں دیکھ رہا ہے اس سے ایسے سوالات تو اس کے اندر پیدا ہوں گے ہی۔''

''شکریہ۔'' نوجوان نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ نے اتنا تو سمجھا۔ ہاں تو مجھے سمجھائیے۔ جو صورت حال آج مسلمانوں کے سامنے ہے یعنی فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے قدم اور ہمارا عدم تحفظ۔ آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بھاجپا کے بڑھتے خونخوار ہاتھ۔ جو ایودھیا، کاشی اور متھرا سے ہوتے ہوئے جامع مسجد، تاج محل اور لال قلعہ کی طرف خونی نظریں گڑائے دیکھ رہے ہیں کہ وحشی قوم، بابر کی اولاد، تم پہلے بھی بابر تھے۔ کل بھی، آج اور ہمیشہ سے۔ اب ہم تمہاری آواز پر روک لگائیں



گے۔ ہم۔ تو یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ کیا آپ کی نظر میں صرف اور صرف یعنی بد سے بد ترین ہوتا ماحول۔ کیا صرف یہ ہمارے مذہبی ہو جانے سے ٹھیک ہو جائے گا؟''

نوجوان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرا سوال صرف یہی ہے۔ میں آج تک اس جیسی کسی مجلس میں نہیں آیا۔ اس لیے معافی چاہوں گا آپ سے — مجھے مجلس کے دستور بھی نہیں معلوم۔ لیکن مجھے بول لینے دیجئے۔ فرقہ پرست جماعتوں اور زہر میں بجھے خیالات رکھنے والوں کی گندی زبانوں سے مجھے جتنی نفرت ہے اتنی ہی اب ان علماء اور مذہبی ٹھیکیداروں سے ہو گئی ہے۔ جو کبھی یوم جمہوریہ کے بائیکاٹ کا نعرہ دیتے ہین اور کبھی مذہبی جنون کو بھڑکانے والی زبان بولتے ہیں۔ ان لیڈروں سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب ہم نے دیکھ لیا ہے، ہم کو ہی مارا جانا ہے، ذلیل و خوار ہم کو ہی ہونا ہے اور جب یہ لیڈر بولنے لگتے ہیں تو شروعات بجائے کل کے آج ہی ہونے لگتی ہے۔ ممبئی، گجرات سارے ملک میں — جلتے ہوئے ان چہروں کا عکس، ذہن سے کون دھوئے گا؟ دلوں میں اترے ہوئے خوف کو کون تسلیاں دے گا؟ نماز؟ گھر سے باہر نکلئے تو ہندو دوستوں کی تسلیاں۔ بسوں، گاڑیوں، دیواروں پر لکھے یکطرفہ نعرے۔ سب اپنی ڈسنے والی زبان نکالے ہم سے یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ دیکھو، اس ملک کے ذرے ذرے میں اب تمہارے لیے شکست لکھی ہیں۔ اور تم ہار چکے ہو — تم ایک ہارے ہوئے کھلاڑی ہو اور ہارے ہوئے کھلاڑی کو جیتتے ہوئے حاکم کے ہر وار کو تسلیم کرنا ہے۔''

اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ ''اب آپ سے سننا ہے۔ مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ یعنی ایک ہندستانی مسلمان، جس کی اوقات اس وقت اس ملک کے حاشیے پر محض ایک ملیچھ کی ہے، اپنی داستان بند کرتا ہے اور اب آپ سے سننے کا خواہشمند ہے کہ کیا آپ نے اس سچ کو محسوس کیا ہے؟ محسوس کیا تو آپ کے نزدیک اس کا کیا حل ہے؟ صرف

نماز......؟''

نوجوان بیٹھ گیا۔

ماحول میں یک بارگی ایسی خاموشی چھا گئی جیسا کہ عام طور پر کرفیو کے دوران ہوتی ہے۔ دہشت اور عدم تحفظ کے احساس میں گھرے لوگ جیسے اپنی اپنی صلیبوں پر چڑھ گئے۔

امیر جماعت کا لہجہ بھرا گیا— یہ کیسی حقیقت لے کر بیٹھ گئے نوجوان۔ آہ! کیسی حقیقت۔ جہاں دیکھو وہیں مسلمان ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ ہندوستان ایک بار پھر تقسیم جیسے سوال کو لے کر ٹوٹنے کی حالت میں آ گیا ہے۔ کتنی آبادی ہوگی اس ملک میں مسلمانوں کی۔ بیس کروڑ؟ کیا غلط کہا ہم نے۔ بیس کروڑ عوام کے صبر کا امتحان لے رہی ہے حکومت۔ آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد جیسی جماعتیں۔ قتل وغارت کی تواریخ اگر مٹھی بھر سکھوں کو دہشت گرد اور آتنک وادی بنا سکتی ہے تو یہ بیس کروڑ کی آبادی؟ نہیں ہونا چاہئے۔ مانتا ہوں— اس لیے اجازت بھی نہیں دیں گے۔ لیکن ممبئی، گجرات میں پورے ملک میں۔ جو مظلوم ہیں۔ جن کے آشیانے اجڑ گئے، جن کی آنکھوں کے سامنے حیوانیت کا رقص عام ہوا۔ وہ اگر ہاتھوں میں اسلحے اٹھالیں اور دہشت گرد بن جائیں تو؟ نہیں بننے چاہئیں۔ لیکن کون سے تسلی بھرے لفظ انہیں ایسا کرنے سے روکیں گے؟ کون سے لفظ انہیں سمجھا پائیں گے کہ اسلحہ اٹھانا حل نہیں ہے۔''

انہوں نے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ''اپنی بات پر آنے کے لیے میں ایک چیز کی وضاحت چاہتا ہوں، ہمیں حکومت اور میڈیا کی زبان اقلیت کہتی ہے، اقلیت۔ یہ لفظ اتنی بار اور اتنے طریقہ سے کہا گیا کہ ہم بزدل ہو گئے۔ ڈرپوک ہو گئے۔ دبو ہو گئے جب کہ سچائی یہ بھی ہے کہ بیس کروڑ کی آبادی اقلیت نہیں ہوتی۔ آیئے ایک نیا نعرہ دیں کہ ہمیں اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت کہا جائے۔''



''دوسری بڑی اکثریت — سکنڈ بگ میجوریٹی امیر جماعت مسکرائے۔ لیکن معاملہ پھر بھی وہیں ٹھہر جائے گا۔ اس طرح کے مسئلوں کا حل محض لفظوں سے ہم نہیں تلاش کر سکتے۔ اصل چیز ہے عمل؟ وہ مسلمان کہاں ہیں جو اپنے طور طریقوں سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے— جو خدا سے ڈرتے تھے۔ جو بیحد پاکیزہ اور معصوم ہوتے تھے۔ جو قربانیاں دیتے تھے۔ اقبال نے کیا صحیح کہا تھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی

ہم لباس، پہناوے، دین، ایمان، خوف خدا سب بھول گئے۔ پھر بھی پوچھتے ہیں کہ ہم مارے کیوں جا رہے ہیں۔ تمام دنیا میں ذلیل وخوار کیوں ہو رہے ہیں۔''

امیر جماعت تھوڑا مسکرائے۔ ''ہماری باتیں اللہ تک کیوں نہیں پہنچتیں، ذرا سوچئے۔ ایک مثال دیکھئے ایک کنواں کھودنا ہے، جہاں پانی ہے، جب تک آپ اس گہرائی تک کنواں نہیں کھودتے ہیں، پانی نہیں نکلے گا— پانی نکلنے کے لیے ضروری ہے جتنی گہرائی میں پانی ہے اتنی گہرائی تک کھدائی ہونی چاہئے۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ ہم نے جیسے تیسے پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور سوچا اللہ پاک ہمارے کام نہیں کرتے۔ ارے جناب دعاؤں کے پورا ہونے کے لیے بھی تو اتنی گہرائی تک جانے کی ضرورت ہے۔ جھوٹ ہم بولیں گے۔ دوسروں کا رزق ہم چھینیں گے۔ دنیا بھر کے گناہ ہم کریں گے اور کہیں گے خدا ہماری دعائیں قبول نہیں کر رہا؟''

●●

اسلم نے اپنی جگہ سے پینترا بدلا۔ کئی بار اسے لگا، نوجوان کے سوال گم ہو رہے ہیں۔ اسے لگا امیر جماعت محض لفظوں کی بھول بھلیاں میں انہیں گھما رہے ہیں۔ اسے لگا ابھی ضرورت یہاں کی ہے۔ یہاں اس پیٹ کی۔ پیٹ کے جہنم کی۔

وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ ڈھیلے ڈھالے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ چہرے

پر، اچانک انگلیوں سے ٹٹولنے پر گرد کی کتنی ہی پرتیں مل جائیں گی۔ اس سے کیا۔

''یہ سب بڑے بڑے لوگ ہیں۔ اس سے کیا۔ سارا فساد سارا ہنگامہ تو بس اس جہنم تک آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس پیٹ کے جہنم تک۔ کیسا مندر کیسی مسجد، کیسا فساد۔ یہ بڑے بڑے لوگ تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ پیٹ کے جہنم اور روزی روٹی کی بات کوئی نہیں کرتا۔ اس کا چہرہ تھوڑا سا بھینچ گیا۔

عبدل بھی ایک دم سے چونک گیا۔ ایک دم سے اپنی جگہ پر مبہوت۔ کہاں اتنے بڑے لوگ، کہاں یہ اسلمو ا۔

اس بیچ اتنا ہوا، اسلمو انے دیکھا۔ امیر جماعت سے بات کرنے والا لڑکا اٹھ کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

''کیا ہے ہاں، بولو۔''

امیر جماعت اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسلمو انے جیب سے دونوں ہاتھ باہر نکال دیئے۔ پھر لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''نوکری، ہمیں نوکری چاہئے۔ نوکری دے سکتے ہیں آپ۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' سید صاحب نے ہانک لگائی۔ عبدل کو بھی گھور کر دیکھا۔

''یہ کوئی وقت ہے نوکری کی بات کرنے کا۔ ابھی دین کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

اسلمو ا کو لگا، اس کے پاس لفظ نہیں کہ انہیں یہ سمجھائے کہ اس وقت دین کی باتوں سے زیادہ ضرورت نوکری کی ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔''

اسلم دھم سے بیٹھ گیا۔ امیر جماعت دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے کچھ سمجھا رہے تھے، مگر اب وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا — یا کہنا چاہئے اب اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔



# شام

(۱)

جس وقت اسلم دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا، مہرن پچھواڑے کے دروازے پر کھڑی، سامنے والے مکان کے عزیز بھائی درزی والے کے لڑکے رفیق کو پرزہ ڈال رہی تھی۔ بھائی کے قدموں کی چاپ سے مہرن چونک اٹھی۔

''لگتا ہے بھیا آ گئے۔''

رفیق کا چہرہ اتر گیا۔

پرزہ رفیق کے ہاتھوں میں تھما کر وہ تیزی سے اندر بھاگی۔ مہرن کے بڑے بھائی اسلم سے رفیق بھی خوف کھاتا تھا۔ پرزہ اپنے لرزتے ہاتھ میں پکڑ کر وہ اپنے گھر کی طرف ایسے بھاگا جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

مہرن جب کمرے میں لوٹی تو اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ اسلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مٹی لپی زمین کے ایک طرف جہاں کا کچھ حصہ سوکھ گیا تھا، ہمیشہ کی طرح اپنے بغیر بالوں کے لمبے پاؤں کو موڑے عبدل بیٹھا تھا۔ سر جھکائے۔ کان میں بیڑی دبی تھی۔ کان سے آدھی جلی بیڑی کے ٹکڑے کو نکال کر اس نے گھبرائے ہوئے اسلم کی طرف دیکھا، جو لرزتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''غضب ہو گیا ابا، غضب ہو گیا۔''

لمبے تنگڑے عبدل نے اپنا کھویا ہوا چہرہ اٹھایا، اسلم کو دیکھا۔ کچھ بولا نہیں۔ بیڑی کو دونوں کالی ہو رہی انگلیوں کے بیچ پھنسا کر، منہ کے پاس لے جا کر دھواں نکالتا رہا۔ اسلم نے دیکھا، جب اس کی بات کی نوٹس نہیں لی جا رہی تو اس نے خود ہی کہنا شروع کیا......

''قصائیوں نے ایک ہندو کو مار دیا۔ قصاب ٹولہ میں ٹینشن ہے۔''

''اشرفوا کہاں ہے؟''

عبدل نے اپنے بیٹے کو یاد کیا۔

''کیا معلوم۔ باقی قصائن کی خیر نہیں۔ فساد ہو کر رہے گا۔ دیکھ لینا۔''

اسلم ایسے خوش تھا جیسے وہ بہت بڑی خبر لایا ہو اور نتیجہ میں انعام ملنے کی امید ہو......

''اشرفوا......اشرفوا......''

اندر 'پتلکی دالان' سے بد بداہٹ کی صدا بلند ہوئی۔ ''اشرفوا......اشرفوا......

جیسے ٹیپ میں چلتے چلتے پرانا گھسا ہوا کیسٹ پھنس گیا ہو۔ ٹوٹی نواڑ کی پلنگ پر گندے، پیشاب سے بھری چادر پر سوتی ہوئی مشتری کے مردہ بدن میں جیسے حرکت ہوئی۔ چپچپا دینے والے پسینے اور آواز کے شور سے نیند کھل گئی تو سخت گرمی کا احساس ہوا۔ گندا پیشاب سے بھیگا تہہ بند جسم سے ایسے چپکا تھا جیسے گلتے ہوئے جسم کا ایک حصہ ہو۔ مکھیاں رہ رہ کر تنگ کر رہی تھیں۔ مشتری نے لیٹے لیٹے کمزور ہاتھوں کو ادھر ادھر بڑھا کر ہتھ پنکھے کی تلاش شروع کی۔ ملنے ڈولنے میں پیروں کی چپچپاہٹ اور پیشاب نکل جانے کا احساس ہوا تو پرانا ٹیپ خود بخود بج اٹھا۔ اشرفوا......مہرن''

چہرے پر حملہ کرتی مکھیوں کی فوج کو ہتھ پنکھے سے بھگاتی مشتری نے گندی سی



گالی سے نوازا۔ ''حرامزادی......کمبخت......''

آواز مہرن نے بھی سنی......اماں کے کمرے میں جاتے ہوئے بھی اسے گھن آتی تھی اف......کتنی بدبو، جیسے ناک ہی پھٹ جائے گی......پھر اماں کے مردہ ہو رہے جسم پر منڈلانے والی مکھیاں......

عبدل نے غصہ سے کر مہرن کو دیکھا۔

''جاتی کیوں نہیں کمبخت......''

مہرن کو باپ کی بات بری لگی۔ منہ بنا کر اس نے اماں کو غصے سے دیکھا۔

''کیا ہے؟ جب تب ایسے ہی چلاتی رہتی ہو۔ شور کرتی ہو......''

''جانا کمبخت......''

اسلم نے آنکھیں دکھائیں۔

وہ ابھی بھی اپنے نصیب کو کوس رہا تھا۔ کیوں ایسے ملک میں پیدا ہو گیا، جہاں نوکری مانگو تو دین کا حوالہ دے کر چپ کیا جاتا ہے......کمبخت جاہل——اب اسے اپنا پورا وجود ہی سڑتا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ گونگا بن گیا تھا۔

''جانا کمبخت'' وہ پھر چیخا۔

''کمرے میں کتنی سیلن ہے، یہ نہیں کہ پوچھ دیں، صفائی کر دیں۔''

''تو کیوں نہیں کرتا۔''

بے وقوفی تھی کہ مہرن کے منہ سے آپ ہی آپ یہ لفظ نکل گئے اور اسلم نے تڑاک سے ایک طمانچہ اس کے گال پر لگایا۔

''منہ لڑاتی ہے کمینی۔''

چٹاخ کی آواز سے عبدل نے گھور کر دیکھا۔ اپنے پچاس باون اونچے چوڑے چکلے سینے پر گچھا ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹخنے سے کافی اوپر تک کی لنگی

باندھی، کمر سے بندھی چمڑے کی پیٹی۔ مضبوط ہاتھ پاؤں، چھ فٹ جتنے لمبے۔ رنگ گورا، بڑے بڑے کان، دیوہیکل، جسم کچھ کچھ واس کوڈی گاما کی تصویر سے ملتا جلتا۔

مہرن کو طمانچہ مار کر اسلم کمرے سے باہر نکل گیا۔ یوں بھی اب یہاں اس کا کام تھا ہی کیا۔ قصاب ٹولہ میں ہونے والے ٹینشن کی کسی نے نوٹس ہی نہیں لی۔ بیچارہ۔ بات پیٹ میں پچتی کیسے؟ وہ فوراً ہی دوسروں کو یہ خبر سنانے نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد مہرن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ باپ کی طرف دیکھا، دھیرے سے بدبدائی۔

''آوارہ کہیں کا۔ کرنا دھرنا کچھ نہیں رعب جمائے گا۔''

عبدل کچھ سوچتا ہوا اٹھا، مہرن کی طرف ذرا بھر بھی نہیں دیکھا، دھیرے دھیرے چلتا ہوا مشتری کے کمرے کے پاس ٹھہرا۔ گلے سے گھڑگھڑانے کی صدا اب دھیمی پڑ چکی تھی، مگر ٹیپ اب تک آن تھا۔ ''اشرفوا...... اشرفوا......''

کبھی مکھیاں تنگ کرتیں، تو کبھی سانس تیز چلنے لگتی۔

''یہ عورت......'' عبدل کو دکھ ہوا۔ برسوں پہلے کی چھوئی موئی سی، نازک سی مشتری ان کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ تب کتنی دھان پان سی تھی اور کیسی پیاری...... کہ چھوؤ تو داغ پڑ جائے۔ تب اس کو چھوڑ کر مشک بھرنے کی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ اور اس کے بدن کا لمس...... کیسا مدہوش لمس ہوتا تھا اسکا، اس کے دیوہیکل جسم میں جیسے سمندر کی طرح تیز لہریں اٹھنے لگتیں...... اور وہ آغوش میں لیتا تو...... کیسی خوشبو ہوتی تھی وہ...... مشتری کے نازک نازک سے جسم کی۔ سانس سانس میں سما جانے والی......

خیالوں کی سیڑھی سے گرتے گرتے وہ ایک دم سے آخری زینہ تک آ گیا۔ ہوش وحواس کے سارے موسم کے لبادے اتار کر بےخبری کی وادی میں ایک عورت پڑی ہے...... گندے گندے کھندرے سے پیشاب کی تیز بو آ رہی ہے...... اور وہ سانسوں



میں سما جانے والی خوشبو کہاں ہے؟

وہ نازک سا بدن کہاں ہے؟

عبدل کی آنکھوں میں ایک قطرہ آنسو کانپا...... اس نے مشتری کے، پیشاب میں لت پت تہہ بند کی طرف دیکھا۔ اور سوچا۔ کل یہی تھی جسے اپنے بچے کا گوہ موت بھی گوارہ نہ تھا— اسلم اشرف، یا مہرن میں سے کوئی بچہ بھی اگر دو سال کی عمر تک پھلیے یا پلاسٹک پر پیشاب کرتا، تو جاڑے کی سردترین راتوں میں بھی اسی وقت اٹھ کر پورا کپڑا بدلا جاتا بچے کو نہایا جاتا، دوسری چادر بدلی جاتی اور خود مشتری جب تک اپنے ہاتھوں کو صابن سے دھو کر مطمئن نہیں ہو جاتی تب تک وہ دوبارہ بستر پر لیٹتی نہیں تھی۔ وہ منع بھی کرتا تھا، ڈانٹتا بھی تھا...... ''پاگل ہو گئی ہو یہ کوئی وقت ہے صفائی کا۔''

مگر نہیں...... مشتری کے مسکراتے چہرے پر گلاب اپنی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں پھیلا کر اپنے شباب کو آواز دیتا۔ ''مجھے چین نہیں پڑتا جی......''

''صبح نہیں ہو گی کیا......؟''

''ہو گی کیوں نہیں جی......؟''

''پھر اتنی رات گئے......؟''

''صفائی بھی تو ضروری ہے جی، فجر کی نماز پڑھنی ہے۔''

کتنی اللہ والی تھی مشتری...... نیاز، فاتحہ، پیر، مزار اور ملیدے پر جان چھڑکنے والی۔ وقت نے آج ایک سلین بھری کوٹھری میں گوہ موت کا ساتھی بنا دیا ہے......

''بیچاری۔ موت ہی نہیں آتی......''

عبدل نے گھوم کر مہرن کی طرف دیکھا۔ دل سے ایک تیز آہ نکلی......

''کپڑے تو بدل دے، بیٹی!''

پتہ نہیں مہرن نے باپ کے درد کو محسوس کیا یا نہیں، لیکن وہ باپ کے حکم کی تعمیل

میں آگے بڑھ گئی۔

عبدل نے گمچھے سے گردن کا پسینہ پوچھا— پھر ایک پل بھی ٹھہرے نہیں— جھولتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

گلی میں نکلے تو سامنے ہی ابو بھائی تانگے والے سے ملاقات ہوگئی۔

'سلام علیکم' ابو بھائی نے مزاج پوچھا۔

'خیریت کیا پوچھتے ہو بھائی۔ مندا چل رہا ہے۔'

ابو بھائی نے ایک پھیکی ہنسی ہنسی۔ ''ہم بھی پرانے ہوگئے عبدل بھائی۔ اور ہم سے بھی زیادہ پرانے اور بیکار ہوگئے، ہمارے پیشے۔ کون پوچھتا ہے ہمیں— سب یہی کہتے ہیں، کوئی نیا کام کیوں نہیں کرتے......؟''

لیکن اس بڑھاپے میں کوئی نیا کام کیسے سیکھوں؟ ان ہاتھوں کا کیا کروں جس نے گھوڑے کو چابک مارنے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں۔

عبدل نے ہاتھ سے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ ''سب رب جانے......''

''اب تو گھوڑوں کو چنا کھلانے کے بھی پیسے نہیں۔ شرفاء نے تو تانگے میں چلنا ہی بند کردیا۔ دن بھر مکھیاں مارتے رہو، تب جا کر ایک دو سواری ملتی ہے۔''

عبدل نے ابو بھائی کے چہرے کی جھریاں گنیں۔ کچھ بولے نہیں۔ یہ باتیں تو اور بھی پریشان کردیتی ہیں۔

دھیرے سے بولے۔ ''اجازت دیجئے ابو بھائی۔ کچھ کام ہے۔''

پھر ''گمچھے'' سے ہاتھ سکھاتے ہوئے خلیل میاں کے گھر کی جانب تیز تیز بڑھ گئے۔

●●

خلیل کا کاروبار تو کوئی خاص نہیں تھا۔ مگر جب سے ان کے لڑکے بحرین میں بس



گئے تھے تب سے وہ پیسہ والے ہوگئے تھے— پہلے ان کی سبزی منڈی گولے کے پاس، جامع مسجد سے کچھ دور ایک چھوٹی سی عطر کی دکان تھی۔ لیکن لڑکوں کے بحرین چلے جانے کے بعد ان کی قسمت ہی بدل گئی۔ ٹوٹا پھوٹا گھر مرمت کے بعد یوں چمچمانے لگا تھا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو— باہر لوہے کا بڑا سا گیٹ۔ عبدل جانتے تھے، پیسہ آدمی کا ماحول تھوڑے ہی بدلتا ہے، خلیل میاں تو وہی عطر والے رہے۔ ادھر لڑکے بحرین سے آئے ہوئے تھے۔ پرسوں جمعرات کے روز خلیل میاں کی لڑکی یاسمین کی شادی تھی۔

عبدل کے دو تین بار دروازہ تھپتھپانے پر اندر سے ایک گندی سی بنیائن اور اونچی لنگی پہن کر خلیل میاں نکل آئے۔

عبدل کو دیکھ کر بولے۔

''تم دیکھ ہی رہے ہو، پریشان ہوں، پھر آنا۔''

''وہ آپ نے......کام کے......متعلق......''

''اوہ۔'' خلیل میاں نے گنجی کھوپڑی کھجلائی پھر بولے۔ ''سو تو تمہیں دیر ہوگئی۔'' عبدل میاں! آج ہی انور چوک سے پکڑ کر سویرے سویرے چار مزدور لے آیا......

''تو جاؤں؟'' عبدل کے ہاتھ چمڑے کی پیٹی تک آ کر کانپ گئے۔

خلیل میاں کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔

''ارے ہاں......بھول ہی گیا......ڈیڑھ سو باراتی آ رہے ہیں۔ بارات سمیع بھائی کے گھر میں ٹھہرے گی۔ تم دیکھ رہے ہو، گرمی کافی پڑ رہی ہے۔ سوٹینک ٹب لبالب بھرنے اور پینے پلانے کے لیے تمہیں تو رہنا ہی ہوگا کیوں......''

''جی صاحب......''

عبدل کے چہرے پر رونق آ گئی۔

''اور سنو۔''

خلیل میاں نے کچھ سوچتے ہوئے لنگی کی ٹانٹ سے پانچ روپے کا ایک میلا سا نوٹ نکال کر عبدل کی طرف بڑھایا۔

''لو! اسے رکھ لو۔''

عبدل نے دیر نہیں کی، جھٹ نوٹ اچک لیا۔ جیسے کہیں اچانک خلیل میاں کا من نہ بدل جائے! نوٹ وہ ایسے دیکھنے لگے جیسے برسوں بعد کسی عزیز ترین شئے کا دیدار ہوا ہو۔

آنکھوں میں ایسی چمک تو مدت بعد آئی تھی۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلا خلیل میاں اندر کب لوٹ گئے۔

پھر وہ رکے نہیں۔ تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب لوٹ پڑے۔



## (۲)

صبح صبح ابو بائی آئے تھے۔

''گھوڑا بیمار ہے کچھ پیسے چاہئے۔''

عبدل کے گم سم چہرے پر یکایک ایسی مسکراہٹ پیدا ہوئی جسے خود پہلی بار میں ابو بھائی بھی نہیں پہچان پائے...... عبدل نے کان میں ٹھسی ہوئی بیڑی جلائی۔

''دنیا میں سب کام آسان ہے ابو بھائی۔ پیسہ کمانا مشکل ہے۔''

''کل کا بدن ہوتا تو دو وقت مزدوری تو کر لیتا، مگر اب مزدوری بھی کون دے گا۔ آگے اللہ اور اس کے رسول کی مرضی''

عبدل سے بیڑی لے کر ابو بھائی نے کش لیا۔ ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

''چوک اور ٹیشن چیختے چیختے گلا سوکھا دو پر کمائی نہیں ہوتی — بڑھاپا تو غارت ہوا سمجھو، بچوں کی سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

''تمہاری تو کچھ کمائی ہو بھی جاتی ہے اور یہاں۔ شادی بیاہ نہ ہو تو سب دن سوکھا ہی رہتا ہے۔ کہاں کا چولہا کہاں کی روٹی۔''

بیڑی بجھ گئی تھی — ابو بھائی نے بیڑی ایک طرف اچھال دی۔ آہستہ سے

بولے۔

''آخر چودھری خاندان کے پرانے نمک خوار رہے ہو۔''

''یہ تو ہے۔''

عبدل نے پسینے بھرے ہاتھوں سے جانگھ کھجلاتے ہوئے کہا۔''باپ دادا سب وہیں پلے بڑھے لیکن اب۔'' وہ دیر تک جانگھ کھجلاتے رہے۔ پتہ نہیں کن خیالوں میں ڈوب گئے تھے۔ زمانے کی نظر چودھری خاندان کو بھی لگ گئی ہے۔ ابو بھائی نے پھر ایک شوشہ چھوڑا۔

''تم چودھری سے کہہ کر بیٹوں کو تو سرکاری نوکری میں رکھوا سکتے تھے۔''

''سب نالائق نکل گئے۔''

عبدل نے اپنے پھٹے ہوئے پاؤں کی طرف دیکھا۔ جس نے زندگی میں کبھی جوتے یا چپل کا لمس محسوس نہیں کیا تھا۔ موٹی موٹی میل کی گانٹھ پڑی انگلیاں۔ ہاتھوں کے ناخن سے نظر نیچی کئے پیروں کی میل کھرچتے رہے۔ سچ تو یہ کہ اب زیادہ بولنے بکنے کا من نہیں کرتا تھا۔ کمائی کچھ نہیں اور گھر پر پڑی جوان جہان بیٹی۔ اور بھی کتنی ضرورتیں تھیں۔ لیکن خالی خولی فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ابو بھائی نے جاتے جاتے ایک شعلہ اور بھڑکا دیا۔

''جتنی جینی تھی، تم تو اپنی عمر جی چکے عبدل میاں! اب بھی وقت ہے — چودھریوں سے کہہ کر اپنے بیٹوں کو وہیں رکھوا دو۔ اچھا چلتا ہوں۔ کہیں اور آسرا دیکھتا ہوں۔''

ابو میاں کے جانے کے بعد بھی عبدل دیر تک غور و فکر میں ڈوبے رہے۔

●●

مچان کے پاس سے چمڑے کی پٹی اتاری۔ دو ایک جگہ سے ادھڑ گئی پٹی پر



دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے رہے۔ پتہ نہیں ایسا کرنے سے کن جذبوں کی تسکین ہو رہی تھی۔ مشتری نے لیٹے لیٹے پھر آواز لگائی تھی۔''اشرفوا۔ اشرفوا۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے عبدل نے مشتری کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دو ایک لرزتی آواز کے بعد پھر سے ماحول میں چپی چھا گئی تھی۔

''اشرفوا۔'' دل سے پھر ایک آہ پھوٹی۔''پتہ نہیں کہاں گیا ہے؟ کمبخت آئے دن کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ چھوٹا تھا تو مشتری سب سے زیادہ اسے ہی مانتی تھی، اس لیے آج بھی بیہوشی کے عالم میں بھی وہ جب تب اس کا نام جپنے لگتی ہے۔

اشرف لاکھ آوارہ سہی، لیکن ایک وہی ہے جو کبھی کبھار برے وقت میں اس کے کام آجاتا ہے۔ پتہ نہیں پیسے کہاں سے لاتا ہے۔ ایک اسلموا ہے...... کیا مجال کہ کبھی ایک وقت کی ترکاری لانے کی توفیق ہوئی ہو۔

''اشرفوا۔ اے اشرفوا۔''

آواز کا گندا سا دھواں پھر سے مہرن کی آنکھوں کو چبھنے لگا۔ باہر سیٹی بج رہی تھی۔ ایسے جیسے حلق میں انگلی پھنسا کر کسی نے منہ سے نکالی ہو۔''کو...... و...... و......''

اس کے دھڑکتے سینے میں طوفان آ گیا۔ وہ اٹھنے کو ہوئی۔ ذرا آگے بڑھ پچھواڑے کی کھڑکی ہی تو کھولنی ہے۔ بس ذرا آگے بڑھ کر — اس نے اٹھنا چاہا۔ پھر قدم تھم سے گئے۔ ابا موجود ہیں، چوری پکڑی گئی تو......

''کو...... و...... و......''

آواز میں تھوڑی جھنکار پیدا ہوئی تھی۔

مہرن کو غصہ آیا۔ بے شرم! یہ بھی کوئی وقت ہے آنے کا۔ لاکھ بار کہا، ایسے وقت میں ابا گھر پر ہوتے ہیں۔ متی ماری گئی ہے۔

وہ پس و پیش میں تھی، تبھی عبدل نے ہانک لگائی۔

''مہرن۔مہرن۔''

''جی''

''کو......و......و......''

اس کے سینے کی دھڑکنیں یوں بڑھ گئیں کہ کوئی بھی قریب آ کر سن لے۔اس بار عبدل نے گندی سی گالی اچھالی تھی۔

''کمبخت......امابلاتی ہیں— سنتی نہیں......''

آواز اتنی سخت تھی کہ مہرن کو رونا آنا آگیا۔سیٹی پھر بجی۔

''کو......و......و......''

اس بار مہرن تیزی سے اماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔اماں ویسے ہی لیٹی تھیں۔جیسے ہمیشہ لیٹتی تھیں۔ہاتھ ڈھلک گئے تھے۔ہتھ پنکھے کی ڈنڈی، ڈھلکے ہوئے ہاتھ میں بندھی تھی۔اماں چت پڑی تھیں۔منہ پر ڈھیروں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔تہہ بند تھوڑا سا اوپر اٹھ آیا تھا۔لکڑی سی سوکھی، اینٹھی پنڈلیوں میں جیسے زندگی کا نام ونشان تک نہ تھا— اس سے پہلے بھی، اسی حالت میں اماں جانے کتنی بار مری تھیں اور کتنی بار زندہ ہوئی تھیں۔کتنی بار یٰسین تک پڑھ لی گئی۔کفن دفن کے انتظام ہونے لگے کہ اماں جی گئیں۔اماں جو موت سے بھی مذاق کرنے کی عادی ہوگئی تھیں۔اماں جو مدتوں سے بے جان تھیں لیکن جیئے جانے کا ناٹک کر رہی تھیں۔ہوش تو جانے وہ کب کا گنوا چکی تھیں۔

یہ چھوٹا سا حجرہ ان کے لیے قبرگاہ ہی تھا۔اور اماں مدتوں سے اس قبرگاہ میں لیٹی تھیں......

مہرن نے اماں کو غور سے دیکھا۔چہرے پر بھنبھناتی مکھیوں کو— تیز بدبو سے اور پیشاب میں سڑنے سے ایک ایسی بدبو اٹھ رہی تھی کہ وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل



تھا......اماں کی آنکھیں کھلی تھیں اور بے حرکت۔کانپتے ہاتھوں سے مہرن نے اماں کے ڈھلکے ہاتھوں کی نبض پر انگلیاں رکھیں مگر ہاتھ جیسے برف کی طرح سرد ہو رہا تھا یعنی زندگی کی کوئی حرارت نہیں تھی۔

مہرن نے تیز چیخ ماری۔

''اماں......''

چمڑے کی پیٹی پر عبدل کے ہاتھ مچلتے ہوئے اچانک رک گئے۔

''مشتری۔کہیں مشتری کو......''

لمبے بھاری بھرکم جسم کو سنبھالتے وہ تیزی سے مشتری کے سیلن زدہ کمرے کے پاس آ کر ٹھہر گئے۔مہرن اماں کے پائے تانے بیٹھ کر چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

مشتری کے ہڈی ہو رہے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور دھیرے دھیرے ہلانے لگے۔لرزتی آواز میں انہوں نے پکارا۔

''مشتری آنکھیں کھولو مشتری! جسم کے اندر سنسناہٹ بھر گئی تھی۔

''مشتری۔آنکھیں کھولو۔''

ابا کی لرزتی آواز سے مہرن کا چیخنا چلانا تھوڑا کم ہوا۔آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے بھی اماں کو ہلانا شروع کیا۔

''اماں۔اماں جی۔''

اور اچانک جیسے بچوں کی چابی بھرنے والی گاڑی کسی خرابی سے رک جاتی ہے، پھر یکایک آپ ہی چلنا شروع کر دیتی ہے۔ٹھیک ویسے ہی اس بے حرکت جسم میں دھیرے دھیرے حرارت پیدا ہوئی۔پھر ٹیپ آن ہوا۔آہستہ سے آواز نکلی۔

''اشرفوا۔پانی......پانی......''

عبدل کے چہرے پر خوشی لہرائی۔مہرن کو دیکھ کر بولا۔

''پانی، جا پانی لے آ۔''

اماں کی بند پلکیں پھر کھل گئی تھیں — مہرن نے پانی کے چند قطرے گلاس ترچھا کر کے اماں کے منہ میں ٹپکا دیئے۔ آنکھ کھول کر اماں نے عبدل کو ایسے دیکھا جیسے دیوار کو دیکھ رہی ہوں، یا چہرے پر بھن بھن کرتی مکھیوں کو۔ کوئی خاص بات نہیں ہو۔

''اللہ۔ شکر تیرا۔''

عبدل بھاری بھرکم جسم کو سنبھالتے ہوئے اٹھا۔ پھر وہاں سے دروازہ کھول کر گلی میں نکل آیا۔ کچھ سوچ کر اس نے چودھری لوگوں کی طرف جانے کے لیے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ مشتری بیمار ہے اور پیسوں کے سارے راستے بند۔ شاید وہاں سے کچھ مالی مدد ہو جائے۔

کندھے پر گمچھا کر رکھ کر، ننگے پاؤں شدید دھوپ میں وہ تیز تیز منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

●●



## (۳)

''اب یہاں بچا کیا ہے اور چودھری بھی کہاں کے چودھری......''

چودھری رشید نے گہری سانس لی۔ چبوترے کے پاس اپنے خاص انداز میں پاؤں موڑ کر بیٹھے ہوئے عبدل کو دیکھا۔

''زمانہ بدل گیا عبدل! چھوٹے چھوٹے لوگوں نے کتنی ترقی کر لی، لیکن چودھری وہیں کے وہیں رہے۔ کچھ لوگوں نے سرکاری نوکریوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ نئے زمانے میں چودھریوں کی جیسی گت بنی ہے تم سے کیا چھپا ہے۔ کل مجال تھی — یہ چھوٹے چھوٹے ہندو جنہوں نے آج بڑی بڑی کوٹھیاں بنالی ہیں، کل چودھریوں کے سامنے ٹھیک طرح سے کھڑے بھی ہو سکتے تھے۔ آج دیکھو تو اکڑ کے چلتے ہیں۔ اب چودھرانے کو ہی دیکھو، باری بھائی مکان بیچ کر گئے تو ایک ہندو کو۔ عالیشان کوٹھی۔ اور وہاں باری بھائی کی کوٹھی میں اس نے مندر بنالیا۔ آج وہاں شنکھ بجتے ہیں۔ پوجا ہوتی ہے۔ چودھری اسی میں تو برباد ہو گئے۔''

اس لمبی چوڑی گفتگو کے بیچ میں عبدل سر جھکا کر ہوں، ہاں، کرتے رہے۔ لیکن وہ یہاں تو دوسرے مقصد سے آئے تھے۔ چودھریوں کے اجڑنے کی تفصیل سننے

نہیں۔ وہ تو اس گھر کے ذرے ذرے سے واقف رہے ہیں—

کون کیا تھا اور کون کیا ہے، وقت نے کتنی کروٹیں بدلیں۔ عبدل کی آنکھوں سے کیا چھپا ہے۔

آنکھ کھلی تو پیشے کے نام پر یہ چمڑے کا مشک تھا، جسے بہشتی باپ نے اپنی کمر سے کھول کر اس کی کمر میں باندھتے ہوئے کہا تھا۔ ''اب یہی تیرا پیشہ ہے۔''

باپ کی انگلیاں پکڑے وہ چودھریوں کی اس کوٹھی میں آیا کرتا تھا۔ رشید کے باپ چودھری محفوظ کو بھیا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ تب یہ کوٹھی، کوٹھی تھی۔ حویلی جیسی۔ اور کیا چہل پہل تھی یہاں۔ چودھری محفوظ کے تین لڑکے تھے۔ لڑکی ایک بھی نہیں سب سے بڑے رشید ٹھہرے۔ باقی دو عنایت اور مجتبیٰ پاکستان جا کر بس گئے۔

اور جا کر بس ہی نہیں گئے ضرورتوں کے تحت کوٹھی کا اپنا حصہ بھی بیچ گئے۔ کوٹھی کے باقی دو حصوں میں دو غیر مسلموں کے پکے مکان اٹھ گئے۔ اب کوٹھی کے نام پر ایک ٹوٹی ہوئی عمارت تھی— ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں— باہر جھولتا ہوا ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ۔ بے رنگ وروغن دیواریں۔ رشید بابو نے سرکاری نوکری میں اونچا عہدہ ضرور پایا تھا، لیکن ایمانداری کا کچھ ایسا بھوت ان پر سوار تھا کہ زندگی بھر کچھ کما نہیں پائے۔ ہاں خیر وخوبی سے لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ دو لڑکے ابھی چھوٹے تھے، پڑھ رہے تھے۔

عبدل نے تو گھر کی رونق بھی دیکھی تھی اور بے رونق ہوتی دیواروں کو بھی۔ چودھریوں کے خوشحالی کے دن بھی دیکھے تھے کہ جب ہاتھی پالے جاتے تھے۔ بیگمات ڈولیوں میں سفر کرتی تھیں۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ دالان خانے میں محتاج اپنی اپنی فریاد کے ساتھ موجود ہوتے۔ اس کا باپ غفار سارا سارا دن باہر سے پانی لا کر مٹی کے بڑے بڑے مٹکوں اور گھڑوں میں بھرا رہا ہوتا۔



گھر کی بیویوں میں پردے کا عام رواج تھا لیکن بھلا غفار سے کس کو پردہ ہوتا۔ چاروں طرف بس ایک ہی آواز تھی۔ غفار۔ غفار۔ غفار ادھر آیئے۔ ذرا اوپر کا پانی بھر دیجئے۔ بڑے چودھری محفوظ میاں وکیل تھے۔ سو دن بھر اپنے موکلوں میں ہی گھرے ہوتے۔ گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے اماں تھی۔ جگ اماں۔ یہ صرف محفوظ وکیل کے لیے اماں نہیں تھیں۔ بلکہ سب کے لیے ہی۔ اماں ہمیشہ سفید براق لباس میں ہوتیں۔ چہرے پر ایسی سنجیدگی ہوتی کہ دیکھنے سے ہی خوف آتا تھا۔

گھر کے کسی بھی اہم فیصلہ کو لینے کا حق اماں کو تھا۔ اماں غفار کو بہت مانتیں۔ بار بار بلا کر پوچھتیں۔

''غفار! محفوظ بہو کے کمرے میں پانی بھرا گیا یا نہیں۔''

''جی اماں۔''

''چلو ٹھیک ہے نئی نویلی ہے نا بے چاری۔ چودھریوں کے طور طریقے سیکھنے میں ابھی وقت لگے گا۔''

اماں ایسے کہتیں جیسے محفوظ کی شادی کو مہینے، دو مہینے بیتے ہوں۔

یہاں تو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ کیا مجال کہ اماں کی زندگی میں کبھی پالکی میں بیٹھ کر بھی کہیں ملنے گئی ہوں۔ اماں کے مرنے کے بعد گھر پہلی بار بے رونق محسوس ہوا تھا۔ لیکن یہ بے رونقی تھوڑے دن تک ہی رہی۔ محفوظ کے تین بیٹے تھے۔ تینوں جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے ویسے ویسے زمانہ بدل رہا تھا۔

پھر ملک نے ایک ساتھ کتنی کتنی کہانیوں کو جنم دیا۔ غفار عبدل کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اور وہی چمڑے کی پیٹی تھی— آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے عبدل تھا اور یہی کوٹھی تھی۔ تب بہشتی سرکاری نوکریوں میں بحال کئے جاتے۔ مناسب تنخواہ تھی۔ وہ رئیسوں اور جاگیرداروں کا زمانہ تھا۔ کچھ بہشتی تو کسی ایک ہی خاندان کو اپنا سرپرست،

اپنا سب کچھ مان کر پوری زندگی گزار دیتے— تب خدمت کا صحیح معاوضہ ملتا تھا۔ تب عزت ملتی تھی۔ اس کی کمر سے چمڑے کی پٹی باندھتے وقت ابا کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن اس پیشے کی بدولت بھوکے مرنے کی نوبت آئے گی۔ وہ پیسوں پیسوں کا محتاج ہوجائے گا۔ یہ پیشہ اپنی قدر کھودے گا۔ اپنی عزت کھودے گا۔ تب گھروں میں اس طرح پانی کی آسانیاں نہیں تھیں۔ تب پانی کے موٹر اور گھر گھر میں چاپاکل نہیں تھے۔ بھشتیوں کی کتنی پوچھ تھی۔ غلامی کے زمانے تک تو سب کچھ ٹھیک چلا۔ پھر آزادی کی نئی اڑان نے سب کچھ ختم کرنا شروع کر دیا۔ چودھریوں کی چودھراہٹ گئی۔

پاکستان بنا، تو گھر چھوڑ چھوڑ کر لوگ پاکستان جانے لگے۔ ساری جائداد اونے پونے بیچ کر لوگ چلے گئے۔

چودھریوں کے محلے اور چودھرانے کی رونق ختم ہوگئی۔ چودھری خاندان پر زوال آگیا۔

کوٹھی تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ رشید کے بھائی اپنے حصے کو بیچ کر پاکستان چلے گئے۔ چودھری رشید اب اپنے نام کے ساتھ چودھری نہیں لکھتے ہیں۔

سرکاری محکمے میں اعلیٰ افسر ضرور ہیں لیکن آج تک ٹوٹا پھوٹا گھر نہیں بنا پائے۔ اسی گھر سے لڑکیوں کی شادی کی۔ اب دولڑکے بچ رہے ہیں۔

اللہ اللہ خیر سلّا ......

عبدل نے پاؤں موڑ لیے اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کی۔

''بابو کی بات۔ بابو چاہیں تو۔''

''ہاں۔ ہاں بولو۔''

رشید نرمی سے بولے۔

''گھر کا خرچ پورا نہیں ہورہا ہے بابو، پانی بھروانا تو سب نے چھوڑ دیا، کسی



لڑکے کو سرکاری نوکری میں جگہ مل جاتی تو۔''

رشید ہنسے۔

''تم کیسی انوکھی بات کررہے ہو عبدل۔ آج چپراسی بننے کے لیے بھی میٹرک پاس ہونا ضروری ہے۔''

''بابو کی بات۔''

عبدل آج ہار ماننے کو نہیں تھا۔

''اچھا دیکھیں گے۔''

رشید میاں نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''اچھا عبدل! کل شہلا اور داماد آرہے ہیں۔ ایک ہفتہ کے لیے اوپر ٹھہریں گے۔ ذرا اوپر کا کمرہ ٹھیک کردو اور ہاں سات دنوں تک نیچے کے چاپاکل سے بھر بھر کر اوپر پانی پہنچانا پڑے گا۔ پہنچادو گے نا......

''بابو کی بات۔''

عبدل کی آنکھ میں اچانک ہی امید کا دیا جل اٹھا۔ پورے سات دن۔ چلو سات دن میں کچھ تو پیسے بن جائیں گے۔

''بابو کی بات۔ لڑکی داماد آرہے ہیں۔ خوش ہوکر وہ بھی کچھ نہ کچھ دے ہی دیں گے— لیکن اس عمر میں۔''

چلتے وقت عبدل نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ جسم جو اوپر سے دیکھنے پر بھلے تگڑا لگتا ہو لیکن اندر سے گھلنے لگا تھا۔

سات دنوں کے لیے کام ملنے کی ایسی خوشی عبدل پر سوار تھی کہ وہ بابو سے باقی باتیں تو کرنا ہی بھول گیا۔

## (۴)

ہلکی ہلکی شام گھر گئی تو کندھے پر گمچھا ڈال کر عبدل سلامو بھشتی والے کے یہاں چل پڑا۔ اتفاق سے سلامو باہر ہی بیٹھا مل گیا۔

''سلام علیکم۔''

سلامو نے سر اٹھا کر عبدل کے مرجھائے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا پھر زمین پر بچھی ہوئی چادر پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ سلامو نے بھشتی کا پیشہ کب کا چھوڑ دیا تھا۔ آج کل وہ بجلی مستری تھا۔ پہلے چودھرانا اور آس پاس کے علاقوں میں اس کے ہم پیشہ کتنے ہی لوگ تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے سب اس پیشے سے کٹ گئے۔ اب شادی، بیاہ، تیج تیوہاروں کے موقع پر ہی بھشتیوں کی ضرورت پڑتی تھی مگر یہ ضرورت تو عام مزدور بھی پورا کر دیتے تھے۔



ایک اکیلا وہ رہ گیا۔ لیکن جیسے ابو بھائی چابک نہ چلائیں تو بھوکے مریں۔ ہاتھوں میں دوسرا ہنر کہاں؟ ابا نے بچپن میں اس کی کمر میں چمڑے کا مشک نہیں باندھا ہوتا تو یہ نوبت نہیں آتی۔

''کہو عبدل بھائی!''

سلامو مطلب کی بات پر اتر آیا۔ ''کہیں کوئی کام ڈھونڈا؟''

''حال برا ہے سلامو بھائی۔ بچے ہی کام پر لگ جاتے تو بھوکوں مرنے کی نوبت نہیں آتی۔''

''نوبت تو اب بھی نہیں آئے گی۔ برا مت ماننا۔ اصل میں تم کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔''

''ایسی بات نہیں ہے سلامو بھائی، ہاتھوں میں کوئی دوسرا ہنر ہو تو ٹانگیں بھی چلاؤں۔''

سلامو نے ایک دوسری ٹھوکر مار دی۔ ''برا مت ماننا یہ جو دوسروں سے پانچ دس روپے لیتے ہو — یہ بھی بھیک مانگنے جیسا ہے۔ سڑک پر بیٹھ کر بھیک کیوں نہیں مانگتے۔ برا مت ماننا۔ اس امید میں ہو کہ دوسرا کوئی تمہیں مہینے بھر کا کام دے گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ بھشتیوں کے دن لد گئے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے عبدل بھائی۔ کچھ آنگ ونگ چلاؤ۔''

''چلاؤ۔ سب یہی کہتے ہیں۔ عبدل نے اپنی پھولی ہوئی ننگی موٹی رانیں پساریں۔ سب یہی کہتے ہیں کام کوئی نہیں دیتا۔''

''مجوری (مزدوری) کرو بوجھ ڈھوؤ۔''

سلامو نے طنز کیا۔ ''اس پورے محلے میں ایک تم ہی بدھو رہ گئے ہو۔ مجھے دیکھو،

انصار، چھوٹو اور کلو کو دیکھو۔ سب اپنی گھر گرہستی میں خوش ہیں۔ ایک تم ہی ناخوش ہو۔ ارے شادی بیاہ میں پچاس روپے مل جاتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ کتنے دن چلیں گے یہ روپے۔ بھیک نہیں مانگ سکتے تو کچھ کرو عبدل بھائی۔''

عبدل کی آواز لرز رہی تھی۔ ''لڑکے ناکارہ نکل گئے۔ ان پر ہی آس تھی کہ بڑھاپے میں سہارا بنیں گے لیکن......''

عبدل کی آنکھوں سے اچانک ہی گنگا جمنا بہہ گئی۔ روکتے روکتے بھی لفظوں کا باندھ ٹوٹ گیا۔

''سلامو بھائی اب تو مرنے کی نوبت آگئی ہے۔ گھر میں تھا ہی کیا جو بیچتا۔ جو تھا وہ بھی بک گیا— مشتری مر رہی ہے۔ لڑکے آوارہ نکل گئے— ایک لڑکی بیاہ کے لائق ہوگئی اور باپ ناکارہ ہے۔ کبھی سوچا تھا سلامو بھائی کہ ایک وقت یہ بھی آئے گا جب مشک والوں کو کوئی پوچھے گا نہیں۔ یہ پیشہ تو گیا سلامو بھائی۔ لیکن ہم زندہ ہیں۔ ہم کہاں جائیں گے، کیا کریں گے۔''

''وقت سے سمجھوتہ۔''

سلامو نے ٹکا سا جواب دیا۔ ''وقت کے بدلاؤ کو سمجھ سکو تو ٹھیک۔ ورنہ بھیک مانگو۔''

''مجھے کام چاہئے۔''

عبدل کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''جیسا بھی ہو مجھے کام چاہئے۔''

''پھر وہی عبدل بھائی۔ اس عمر میں کون کام دے گا تمہیں۔ بوجھ کیوں نہیں ڈھوتے۔ مجوری کیوں نہیں کرتے۔؟''

●●

''بوجھ کیوں نہیں ڈھوتے...... مجوری کیوں نہیں کرتے۔''



شہر کو رات کی تاریکی نے چھپا لیا ہے۔ لوٹتے وقت عبدل کے ذہن میں بس یہی دو جملے تیر رہے ہیں۔

بہت برا ہے زمانہ کا ترقی کر جانا۔ اس سے بھی برا ہوتا ہے کسی پیشے کا مر جانا......

دماغ بوجھل ہے— اور جسم میں تھکن سوار ہے۔

عزیز بھائی۔

جبار بھائی۔

مولوی صاحب۔

اور بھی کتنے گھر اور بس ایک ہی لرزتی آواز۔ ''مجھے کام چاہئے۔''

اور ہر جگہ سے بس ایک ہی آواز— ''اپنی عمر دیکھی ہے عبدل میاں۔ مجوری کرلو۔''

مرحوم باپ کا چہرہ نگاہوں میں ابھرتا ہے تو چہرے پر ایک گہری شکن آجاتی ہے......ابا......کوئی اور ہنر کیوں نہیں دیا ان ہاتھوں میں۔ مشک کی پٹی کیوں باندھی۔ یہ پیشہ مر گیا۔ اور مر رہا ہے تیرا ناکارہ بیٹا بھی......

اندر سے جیسے کوئی آواز حملہ کرتی ہے......

''تم کس لائق ہو عبدل میاں......؟''

''تم کیا کرسکو گے۔؟''

ہر جگہ سے وہی ٹکا سا جواب ملا ہے۔ چودھری رشید نے بھی اپنی مجبوری کا واسطہ دیا......

''کہ میاں عبدل نہ آج ہاتھی ہے اور نہ ہاتھی پالنے والے، چودھری تو کب کے مر چکے۔ ہم سے اچھے تو یہ کل کے چھوٹے ہیں جو آج اپنی اپنی دکانیں اٹھا چکے ہیں۔ محل پر محل کھڑا کر رہے ہیں اور ہم، ہم تو خود مقروض ہو رہے ہیں عبدل میاں۔ ہم کسی کو

کیا دیں گے۔ ہمارے پاس ہے کیا دینے کے لیے......

عبدل نے رنگ وروغن سے محروم ہوتی کوٹھی کی دیواروں کو دیکھا۔ دل سے ایک آہ نکلی۔کل رنگ وروغن تھے، دل بھی بڑا تھا۔ آج رنگ وروغن نہیں تو کچھ بھی نہیں بچا۔ ایک پرانا منظر آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ لگا ابھی کل کی بات ہے، کتنے دن ہو گئے۔ ممانی کے کمرے میں پانی پہنچانے جاتے ہوئے اچانک وہ ٹھہر گیا۔ دیکھا تو چودھری صاحب کسی سے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

چودھری: ''دماغ خراب ہو گیا ہے لوگوں کا۔ کہتے ہیں چودھریوں کے دن لد گئے۔ ہماری باقی بچی زمینوں پر بھی سرکار کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ہم بھی کم نہیں ہیں۔ ہم بھی دکھا دیں گے کہ چودھری چودھری ہوتے ہیں۔ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔

ایک شخص: ''ایک بری خبر ہے حضور! چک بندی آفس سے پیدل چل کر آ رہا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ انائیٹ والی آخری زمین بھی چک بندی والوں نے ہتھیا لی۔''

چودھری: خاندانی وقار، کی میت رکھی ہے میاں۔ **اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلَیہِ راجعون** نماز جنازہ پڑھنے کا انتظار ہے بس اور اس لاش کو ہمیشہ کے لیے پرکھوں کے قبرستان میں دفن کر دینا ہے۔

چودھری رشید کے آنسو نکل آئے تھے۔



## (۵)

زمین پر لیٹے لیٹے جانے کب آنکھ لگ گئی۔ مچھروں کے کاٹنے سے آنکھ کھلی۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔ ہاتھوں کو کھجلاتے ہوئے عبدل نے دیکھا، باہر کا دروازہ تھوڑا چرمرایا تھا۔ مشتری کے کمرے کے پاس لالٹین کالا ہوا پڑا تھا۔ جس کی لو بجھنے کو تھی۔

دروازہ تھوڑا اور چرمرایا اور کوئی تیزی سے اندر آ گیا۔

''کون؟''

عبدل کی چیخ نکل گئی۔

کوئی سایہ تھا جو دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ پھر اسے لگا، سایہ دھیرے دھیرے سرک رہا ہو۔

"کون ہے......؟"

عبدل نے پھر تیز آواز میں پکارا، دوسری طرف کھاٹ پر پڑے اسلم نے اٹھ کر لالٹین کی لو بڑھائی۔ ابا کی آواز سے جاگی ہوئی مہرن کی چیخ نکل گئی۔

"اشرف بھیا۔"

سامنے اشرف کھڑا تھا۔ چہرے اور کپڑوں پر خون کے داغ تھے۔

"شی......"

لالٹین کی لرزتی لو میں اشرف کا خوفزدہ چہرہ لرز رہا تھا۔ اس نے تیزی سے کنڈی چڑھائی پھر اسلم اور مہرن کی جانب دیکھ کر بولا......

"مجھے کہیں چھپالو......وہ......"

"کیا کر کے آیا ہے......؟ کمبخت......"

عبدل نے ایک گندی سے گالی بکی۔ "کہاں تھا اتنے دن؟ کس سے لڑائی کی؟ کس کو جان سے مار ڈالا، کیا کیا ہے؟ بولتا کیوں نہیں ہے؟"

اندھیرے میں اشرفوا کی آنکھ چمکی۔ وہ ناگواری سے بوڑھے کی بڑبڑاہٹ سن کر چیخا۔

"چوپ......پ......"

عبدل جیسے اپنی جگہ تھم گیا۔ باہر کچھ قدموں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز رک گئی۔ جیسے سب کے دل کی سوئیاں اچانک چلتے چلتے بند ہوگئی ہوں۔ ایک پراسرار دہشت ناک سناٹا تھا۔

عبدل کا حیرت سے کھلا ہوا منہ۔ مہرن کی خوفزدہ آنکھیں۔ اسلم کی گہری چپی اور



ڈری ڈری نگاہیں۔ اشرفوا جیسے دیوار سے سٹ گیا تھا۔ لالٹین کی لو کانپ رہی تھی۔ اب تو جیسے پورا شیشہ ہی کالا پڑ چکا تھا۔

تبھی جیسے ماں کے کمرے سے وہی گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح صدا بلند ہوئی

اشرفوا......رے اشرفوا......

ہلکی روشنی اور خوفزدہ ماحول میں جیسے اس دبی گھٹی آواز نے سب کو اچانک چونکا دیا۔

اشرفوا نے تیز لمبی سانسوں کے بیچ اماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ تین چار بار اشرفوا کی آواز نکال کر اماں پھر اپنے شعور کے دائرے سے دور نکل گئی تھیں۔

اور یہاں چپی تھی۔ گہری چپی۔ لالٹین کی لو یکایک زور سے کانپی۔ باہر کسی کتے کے بھونکنے کی آواز ہوئی۔ پھر لالٹین یکایک بجھ گئی۔

اوہ...... یہ کیا ہوا؟

اندر جیسے پستول سے نکلی ہوئی گولی، گرم لاوے کی طرح جسم کو چھلنی کرتی ہوئی چاروں طرف ناچ رہی تھی۔ اب کسی کا چہرہ صاف نہیں تھا۔ باہر بھی گہری خاموشی تھی۔ پھر یکایک لگا، بہت سے لوگ دوڑتے بھاگتے دائیں بائیں سمتوں میں چلے گئے ہوں......

اشرفوا نے لمبی گہری سانس لی—جو اتنی تیز تھی کہ عبدل تک اس کے سانس لینے کی آواز پہنچ گئی۔ مہرن نے طاق سے ماچس ڈھونڈ نکالی۔

کالا پڑا لالٹین تیزی سے بھبھکا۔ اس کی لو کانپتے ہوئے بھی جلتی رہی۔ "اچھا ہوا وہ چلے گئے۔"

اشرف کھاٹ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"یہ سب۔" اشرف طنز سے مسکرایا۔ "جینے کے کھیل ہیں ابا۔ تم نہیں سمجھو گے۔

سمجھ لو یہ سب کرنا پڑتا ہے، یہ سب کرنا ضروری ہے۔''

''کیا ضروری ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔''

'تم سمجھو گے بھی نہیں ابا۔ اے مہرن پانی پلا۔ کچھ گھر میں کھانے کو ہے؟'

اشرف نے تیز آواز میں پوچھا۔

مہرن دوڑ کر پانی لے آئی۔ ''کھانے کو تو کچھ نہیں بھیا۔''

''مجھے معلوم تھا۔'' اشرفوا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''یہاں کیا ہو سکتا ہے کھانے کے لیے—اور یہ اسلموا خالی بیٹھ کے کھاٹ توڑتا ہے۔''

اشرف نے بڑے بھائی کی طرف نفرت سے دیکھا۔

اسلم چڑھ دوڑا...... ''اے......ای اشرفوا......زبان سنبھال کر بات کر۔ ورنہ دو ہاتھ دونگا کہ......''

''چل۔ چل دو ہاتھ دوں گا......''

اشرف نے نقل اتاری......پھر مہرن کی طرف دیکھ کر بادشاہوں جیسی ہنسی ہنسا۔

جیب سے مڑے تڑے پانچ کے بہت سارے نوٹ نکال کر مہرن اور اسلم کو دکھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ، دیکھ یہ کمائی ہوئی ہے۔ اتنی ڈھیر ساری۔'' اس نے اسلم کی طرف اشارہ کیا...... ''یہ تو......سالا تو سات جنم میں نہیں کما سکتا۔''

پیسے کو غور سے عبدل کی چندھیائی آنکھوں نے بھی دیکھا......آنکھوں میں چمک لہرائی۔ مہرن کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئی تھیں اور اسلم کسی لالچی کی طرح مڑے تڑے نوٹوں کو گھور رہا تھا۔

''دیکھا۔'' اشرف نے پھر ایک ٹھہاکہ لگایا......اور نوٹ دوبارہ پاکٹ میں ڈال لیا۔



''ایک پتہ دے نا......؟'' مہرن دھیرے سے بولی۔

''لے رکھ لے مہرن......''

دس کا پتہ نکال کر اشرف نے ایسا بڑھایا جیسے کسی بادشاہ نے خوش ہو کر رعایا کو انعام سے نوازا ہو...... ''لے خوش رہ......عیش کر۔''

''یہ سب......''

عبدل نے محسوس کیا، اس کے لفظ ناکارہ ہو رہے ہیں۔ پیسوں میں سچ مچ بڑی قوت ہے۔ مشتری بستر پر پڑی ہے۔ مہرن جوان ہو رہی ہے......

اس کی صحت گر رہی ہے۔ چودھریوں کا دیا ہوا یہ حجرہ بارشوں کا منتظر ہے اور سب کچھ ختم۔ لیکن ابھی وقت ہے۔ ابھی سب کچھ بچایا جا سکتا ہے اور بچانے والی صرف ایک ہی چیز ہے—پیسہ......لیکن پیسہ کہاں سے آئے گا؟

لالٹین کی لو ایک بار پھر زور سے کانپی اور اس سے کہیں زیادہ کانپا۔ عبدل کا چہرہ......وہ اشرف کے چہرہ کو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کوئی جرم کر کے آیا ہو۔ کوئی خون کر کے آیا ہو، لیکن اشرف کے چہرے پر باپ کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ عبدل بیچارگی کے آنسوؤں کو آنکھوں میں پی گیا۔ آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''یہ سب کسی سے چھینا ہے۔ کسی سے جھگڑا کیا ہے۔ بولتا کیوں نہیں۔''

اشرف نے باپ کو جیسے ایک بیکار کی چیز سمجھتے ہوئے طنز سے دیکھا۔

''یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ جینے کے لیے۔'' یہ اس کا آخری جملہ تھا۔

''جینے کے لیے؟ ہم نہیں جیتے کیا؟''

عبدل کی آواز میں غصہ تھا۔

''تم جیتے ہو......ہا......''

اشرف نے بڈھے باپ کو ایسے دیکھا جیسے اس نے ایک دلچسپ مذاق کر دیا ہو۔

اس پر جیسے ہنسی کا تیز دورہ پڑ گیا۔

''تم کہتے ہو......تم جیتے ہو......ارے تم جانتے بھی ہو۔ جینا کیا ہوتا ہے؟ تم نے چودھری کے یہاں غلامی کی ہے اور انہوں نے پشت در پشت غلامی کا صلہ یہ حجرہ دیدیا ہے تمہیں۔ بس یہی حجرہ، تمہاری آج تک کی خاندانی غلامی کی کمائی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے تم— کوڑھ پھوٹ چکا ہوتا تمہیں۔ مہرن، اسلم، ہم سب سے بھیک منگوا رہے ہوتے۔ تم جانتے بھی ہو کمائی کیسے کی جاتی ہے۔ ایک پھٹا ہوا مشک ہے تمہارے پاس، جو آج دو روپیہ میں بھی کوئی نہیں خریدے گا اور پاؤں ہاتھ چلانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ پڑے پڑے کھانے کو ملتا رہے، اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں چاہئے۔ تم تو سڑک پر بھیک مانگتے بھکاریوں سے بھی بدتر ہو۔ وہ بھی روزانہ کچھ نہ کچھ کما لیتے ہیں اور تم......اشرف نے نفرت سے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔

مہرن نے چونک کر اس انجانے سچ سے آنکھیں ملائیں۔ بھیا نے غلط کیا کہا ہے؟ اسلم حیرت سے اشرف کا چہرہ پڑھ رہا تھا اور عبدل۔ وہ تو سناٹے میں تھا۔ گہرے سناٹے میں......وہاں جان ہی کتنی تھی۔ اندر تک جیسے لفظوں کا زہر اتر گیا ہو۔ ہر سانس ایک کڑواہٹ، ہر پل ایک تلخی۔ باہر پول پر چوکیدار نے دو کا گھنٹہ مارا۔

اور......

لالٹین کی لو پھر سے تھرتھرانے لگی۔ اشرف پلنگ سے اٹھا۔

''میں جا رہا ہوں......''

یہ پوچھنے کی ہمت کسی میں نہیں بچی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے......

''مہرن دروازہ بند کر لو......''

پچھواڑے کا دروازہ کھلا، پھر کنڈی لگانے کی آواز ہوئی۔



سائیں......سائیں......

چاروں طرف گہرا سناٹا پھیل چکا ہے......

اسلم کھاٹ پر واپس چلا گیا ہے۔ مہرن نے بھی آنکھیں بند کر لی ہیں۔

عبدل نے سونے کی کوشش کی لیکن دماغ میں جیسے ہتھوڑے برس رہے ہوں۔

ٹھن......ٹھن......ٹھن......ٹھن......

اشرف کے کڑوے سچ نے آج برسوں بعد اسے، اس کی اوقات کو لالٹین دکھادی ہے۔

''ایک بھکاری سے بھی بدتر ہو تم عبدل میاں! خاندانی پشت در پشت غلامی کے صلے میں چودھری نے یہ حجرہ تمہیں نہیں دیا ہوتا تو بھیک مانگ رہے ہوتے تم......کوڑھ پھوٹ گیا ہوتا تمہیں......''

جیسے اچانک چرک کے اجلے اجلے دھبے اسے گھیرنے لگے ہوں۔

لالٹین کی لو ایک بار پھر تھرتھرا کر چپ ہوگئی۔

اماں پھٹے ریکارڈ کی طرح پھر بجیں۔

''اشرفوا......''

اندھیرے میں لڑکھڑاتا ہوا عبدل دیواروں کو ٹٹولتا۔ مہرن کے بستر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

مہرن نے آنکھیں اٹھائیں۔

عبدل کمزور آواز میں بولا۔

''دس کا وہ پتہ دیدے، جو اشرف تجھے دے کر گیا ہے۔ کام ہے۔''

اتنا کہہ کر آواز لڑکھڑا گئی۔ وہ بیماروں کی طرح دوبارہ اپنے بستر پر آ گیا۔

●●

## (٦)

پھر اشرف تین چار دن نظر نہیں آیا......

اس حادثے کے بعد گھر میں ایک نئی تبدیلی آ گئی تھی۔ عبدل صرف ایک تماشائی تھا۔ وہ گھر کے بدلے بدلے رویے کو دیکھ رہا تھا۔ اس دن، پورا دن اسلم گھر سے باہر نہیں نکلا۔ پورا دن کھاٹ پر لیٹتے، بیٹھتے، سوچتے گزر گیا۔ پتہ نہیں کیوں، مہرن کی آنکھوں میں بھی اسے تیز نفرت نظر آئی تھی۔ جیسے ان سب کا ذمہ دار وہ ہو۔ دس روپے



جو مہرن سے ملے تھے وہ اس نے مشتری کی دوا میں خرچ کر دیئے۔ پاس میں بیڑی بھی نہیں تھی۔ پھر اچانک ہی وہ گمچھا کندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مہرن سے بغیر نگاہ ملائے ہوئے بولا۔ اماں کا دھیان رکھنا......

کہاں جانا ہے اسے معلوم تھا...... پہلی چوکھٹ سلامو بجلی والے کی تھی۔

اتفاق سے سائیکل لے کر اسی وقت سلامو نکل رہا تھا۔ بے وقت عبدل کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

''کیا بات ہے عبدل بھائی؟''

''بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ کام چاہئے۔''

عبدل کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ پیٹ تک جسم ننگا تھا۔ بال گندے اور لٹھ جیسے ہو رہے تھے۔ پاؤں میں چپل بھی نہیں۔ ننگا دھڑ پسینہ سے تر بتر۔ نیچے پاؤں سے کافی اٹھا ہوا تہہ بند لپیٹے۔ بڑی آرزو اور منت کے ساتھ عبدل نے کہا۔

''سب کروں گا بھائی۔ جو کہو گے۔ بس اپنے ساتھ رکھ لو۔ جہاں چلتے ہو وہاں لے چلو۔''

''کیسے لے چلوں، حد ہے......''

سلامو نے اس چھ فٹ جیسے دیو کو دیکھا، جو کسی قدیم یونانی کہانی کا ہیرو لگ رہا تھا۔

جسم سے بدبو پھوٹ رہی تھی۔

سلامو نے کہا۔ ''ٹھیک ہوتے تو لے بھی چلتا۔ مگر ایسی صورت میں — تمہارے پاس تو کام کا ایک کرتہ پائجامہ بھی نہیں، ارے بجلی کے کام کے لیے اچھے اچھے گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں ان کپڑوں میں جاؤ گے۔ دردرا دیں گے۔ سب دروجے (دروازے) سے ہی بھگا دیں گے۔ وائر ٹھیک کرنے، الیکٹرک فیٹنگ

کرنے گھروں کے اندر جانا ہوتا ہے،عورتوں سے تمیز سے بات کرنی ہوتی ہے۔تب پیسے ملتے ہیں ایسے مفت میں تھوڑے ہی ملتے ہیں۔''

''میں سب سیکھ لوں گا۔''

عبدل نے روہانسی صورت بنا کر کہا۔

''نہیں نہیں،تمہاری وجہ سے میرا روجگار (روزگار) بھی ڈھیلا پڑ جائے گا،نہیں بابا نہیں۔''

''س......لا......مو...... بھائی......''

عبدل کی آواز درد کے اتنے گہرے کنویں سے نکلی تھی کہ سلامو کے جسم میں ایک پل کے لیے سنسناہٹ پھیل گئی۔

اس نے دھیرے سے کہا......''کاہے کو میرا وقت کھوٹا کرتا ہے عبدل بھائی! کل صبح آجانا، پھر دیکھیں گے۔ہاں شروع شروع پیسہ نہیں ملے گا۔سمجھے، کام اچھی طرح سیکھ جاؤ گے تب ملے گا......

عبدل کے تاریک چہرے پر جیسے صبح کی سپیدی نمودار ہوئی ہو۔داڑھی کے بالوں کو نوچتا ہوا بولا......

''اچھا......سالاما......لیکم، چلتا ہوں بھائی۔''

''ارے ہاں سنو۔''

سائیکل پر بیٹھتے ہوئے سلامو نے یاد دلایا۔''آنا ہو تو ٹھیک کپڑوں میں آنا۔اس حلئے میں مت آنا۔''

''جیسا حکم......''

''پھر ٹھیک ہے کل آجانا......''

سلامو پینڈل مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔



●●

صبح ہی صبح جب عبدل بالٹی لے کر باہر گیا تو اسلم اور مہرن نے حیرت سے دیکھا۔عبدل آج سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔پھر لکڑی والے بکس میں وہ دیر تک پتہ نہیں کیا ٹٹولتا رہا۔ٹٹولنے کے بعد آخر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ ہی گئی۔یہ ایک چوڑی موری والا پینٹ تھا جو اس کے باپ غفار کو ایک زمانے میں چودھری محفوظ نے دیا تھا۔چودھری محفوظ میانے قد کے تھے۔غفار کو بھی یہ پینٹ پوری نہیں آتی تھی۔اسے تو اور چھوٹی پڑے گی......لیکن اس سے کیا ہوتا ہے......ڈھونڈنے پر ایک پرانا کرتا بھی مل گیا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟''مہرن اور اسلم نے آنکھوں آنکھوں میں باتیں کیں۔

ایسا کیا کام آ گیا کہ ابا کو اپنی پہچان بدلنی پڑی۔ورنہ ان کی پہچان تو وہی تھی......ٹخنوں سے کافی اوپر اٹھا ہوا تہہ بند، کندھے سے جھولتا گمچھا۔جاڑا گرمی یا برسات ہو۔کسی کے یہاں بھی شادی بارات ہو۔ابا کا تو بس ایک یہی لباس تھا۔آج ان کو یہ کیا ہو گیا......

لیکن ابا سے کون پوچھے؟

بالٹی اٹھا کر عبدل اندر آئے، پھر نہانے بیٹھ گئے۔

مہرن اور اسلم چوری چھپے حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔اور یہ کیا۔نہا دھو کر عبدل نے عجب سا پتلون اور کرتا چڑھا لیا تھا۔اف کیسی شکل بن گئی تھی۔

مہرن کو لگا، وہ ہنس دے گی۔اسلم کو بھی اپنی ہنسی روکنا مشکل پڑ رہی تھی۔لیکن وہ چپ بیٹھا باپ کی نئی حرکتوں کو دیکھتا رہا۔پھر وہ بغیر کچھ بولے سلامو بجلی والے کے یہاں چلا گیا۔صرف ایک چیز کی کمی تھی۔چپل نہیں تھی، عبدل کے پاس۔

اسے اس حلئے میں دیکھ کر سلامو اور اس کی بیوی خوب ہنسے۔

''بس ایک چپل اور ہوجاتی'' سلامو نے ہنستے ہوئے کہا۔''نہیں ہے تب بھی کوئی بات نہیں اور عبدل بھائی تمہارے ناپ کی چپل فیکٹری والے بناتے کہاں ہیں۔''

کھانا ٹفن میں لے کر جھولے میں ڈال کر سلامو نے سائیکل کے آگے لٹکا دیا۔

پھر بھاری بھرکم عبدل کو بھی آگے ہی بیٹھنے کے لیے کہا۔

کسی بھی دیکھنے والے کے لیے یہ ایک انوکھا منظر ہوتا۔گھنٹی ٹنٹناتے ہوئے سلامو نے سائیکل آگے بڑھادی۔

اس دن سارا دن سلامو عبدل کو ادھر ادھر ٹہلاتا رہا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مشتری کی طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔عبدل کو غصہ اس بات کا تھا...... کہ ......بس......سالا چائے تک اکیلے ڈکارتا رہا۔ اسے پوچھا تک نہیں۔لیکن پہلا دن تھا۔ بولنے سے فائدہ بھی کیا تھا؟ سلامو کام کیا سکھاتا، بس اسے بیکاروں کی طرح باہر بیٹھا دیتا۔ پھر واپس آکر کہتا......کوئی خاص کام نہیں تھا عبدل بھائی۔بس ایسے ہی...... چھوٹا موٹا کام تھا......اس بیچ وہ باہر یا تو اوزار سنبھالتا یا اس کی سائیکل کی دیکھ ریکھ کرتا۔ چھوٹی کمائی بھی ہوئی ہوتی تو چلو کوئی بات نہیں۔

●●

دوسرے دن جب اسی طرح سلامو ٹہلاتا رہا تو اسے غصہ آگیا۔

''میں تمہاری سائیکل دیکھنے کے لیے تو نہیں آیا ہوں سلامو بھائی......''

''معنی......؟''

''معنی یہ کہ تم کچھ بتاتے سکھاتے نہیں۔صرف باہر کھڑا کر دیتے ہو......''

''دیکھو عبدل بھائی......'' سلامو نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا......

''شروع میں ایسے ہی چلتا ہے، لوگ پہچانیں گے نہیں تو کام کیسے دیں گے؟''



''لیکن کام کروں گا کیا۔تم تو کچھ بتاتے نہیں......''

اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے......''چائے بھی اکیلے ہی ڈکار جاتے ہو......گھر کے اندر جا کر میرے بارے میں سوچتے تک نہیں......''

''لو......سنو......'' سلامو قہقہہ لگا کر ہنسا......''گھر والوں کو تو خود ہی خیال ہونا چاہئے کہ بجلی مستری کے ساتھ بھی کوئی ہے، میں کیا کہنے جاؤں گا انہیں کہ تمہارے لیے اسپیشل چائے بنادیں......''

''اسپیشل کیوں......تمہارے لیے اسپیشل بنتی ہے کیا......؟''

''دماغ مت خراب کرو عبدل میاں — میں تمہیں نہیں لایا، تم اپنی مرضی سے آئے ہو......''

''مرضی سے آیا ہوں تبھی تو گدھا بن رہا ہوں......''

عبدل کو بھی غصہ آگیا......

''دیکھو، غصہ نہیں کرو......'' سلامو نے نیا پینترا چلا۔''تمہیں شروع سے ٹریننگ دینے کی ضرورت ہے۔ابھی ساتھ ساتھ رہو، بہت کام آئیں گے۔''

عبدل کا غصہ تھوڑا دھیما ہوا۔لیکن دو چار روز میں جب سلامو اپنی ٹہلانے والی عادت سے بعض نہیں آیا تو اس نے اپنا صرف فیصلہ سنا دیا۔''سلامو بھائی! تم بہت گدھا بنا چکے، اب میں تمہارے ساتھ کام نہیں کرتا......''

وہ پھر گھر آگیا۔غصہ اتارنے کے لیے اس کے پاس وہی پرانا کپڑا تھا۔اس نے پینٹ اور کرتا دوبارہ بکس میں ٹھونس دیا اور پھر سے اپنی پرانی پہچان پر لوٹ آیا۔

اس دن رات گئے چوروں کی طرح اشرف پھر آیا تھا۔اماں کی بیماری کے لیے اس نے کچھ روپئے بھی دیئے۔ساتھ میں طعنہ بھی۔

''پیسہ بڑی مشکل سے آتا ہے۔ٹانگ پر ٹانگ دھر کے بیٹھنے سے نہیں۔''

مجبوری تھی، اس لیے عبدل کو سہنا ہی تھا۔ ورنہ اشرف کی بات پر وہ اس کی زبان کھینچ لیتا۔ اتنا دم خم اب بھی تھا۔ لیکن اتنا ہوا کہ اشرف کی ان حرکتوں نے اس کے اندر دبی ہوئی چنگاری کو جگا دیا تھا۔ اب اسے غصہ بھی آجاتا اور وہ کچھ کرنے کا خواہاں بھی تھا۔

اس بیچ اسے پتہ چلا کہ اس کے محلے کا مراری رکشا والا کافی بیمار ہے۔

یہ خبر اس کے دوست لٹن نے دی تھی، جو مراری رکشے والا کا چہیتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ رکشا چلا سکو تو دونوں کے فائدے ہو جائیں گے۔ وہ ایک ہفتہ تک کہیں آنے جانے کے لائق نہیں ہے۔ اس کی ڈیوٹی تم سنبھال لو۔ جو ملے، اس میں سے آدھا آدھا بانٹ لینا۔ مراری ٹھیک ہو جائے گا تو مالک سے کہہ کر وہ تمھیں نیا رکشا دلوا دے گا۔

''چلو ٹھیک ہے......''

عبدل کی آس بندھی......رکشا کبھی چلایا تو نہیں مگر اس سے کیا، کرنا ہی کیا ہے۔ سیٹ پر بیٹھ کر پیڈل ہی تو مارنا ہے۔

جھٹ پٹ اس کی مراری سے بات ہو گئی اور وہ راضی ہو گیا۔ مراری نے کہا تھا، اس کے لیے ایکسپرٹ آدمی ہونا چاہیے...... ہوں...... ایکسپرٹ کیا ہوتا ہے۔ رکشا چلانا ہے، سو کون سا مشکل کام ہے۔ پہلے دن رکشا لے کر عبدل کی جلد بازی دیکھنے لائق تھی۔ او بھائی...... ادھر ایک طرف ...... او سائیکل والے بھیا...... ذرا ہٹ کے......ایک......طرف بچا کے......او میم صاحب!'' اسے مزہ آرہا تھا۔ لیکن یہ مزا دیر تک برقرار نہیں رہا۔ سامنے سے آنے والے سانڈ سے اس کا رکشا لڑ گیا۔ اور رکشے پر بیٹھا مسافر تیز چیخ کے ساتھ گرا اور اٹھ کر اس نے دو چار جھانپڑ عبدل کو جڑ دیئے۔ اور گالیاں بکتا بغیر پیسہ دیئے آگے بڑھ گیا۔ رہی سہی کسر سانڈ نے پوری کی۔ اس نے



رکشا کو کئی دھکے مارے...... دیکھنے والے جمع ہو گئے۔ کچھ تیز تیز آواز میں ہنسنے لگے۔ عبدل کی بگڑی حالت دیکھ کر سب کو مزہ آرہا تھا۔ آگے کا پہیہ ترچھا ہو گیا تھا۔ چوٹ عبدل کو لگی تھی۔ وہ تو قسمت تھی کہ سانڈ کے سیدھا حملہ کرتے ہی وہ ہٹ گیا تھا۔

بڑی مشکل سے غراتا ہوا سانڈ جب ایک طرف چلا گیا تو عبدل نے ٹوٹے پھوٹے رکشے کو دیکھا۔ پھر غصہ میں مراری رکشے والے کے یہاں لا کر پٹک دیا۔ ''تم جانو تمہارا کام جانے، یہ میرے بس کا روگ نہیں......''

''اس کا حرجانہ کون بھرے گا، تیرا باپ......؟''

مراری کا اتنا کہنا تھا کہ عبدل کے بازوؤں کی سوئی مچھلیاں اچانک جاگ گئیں۔

وہ غراتا ہوا مراری پر چڑھ دوڑا۔ مراری معافی نہیں مانگتا تو وہ اسے چھوڑتا بھی نہیں۔ یہ کام بھی اس کے بس کا نہیں۔ گھر آکر اس نے سوچا۔ یہ اسے کیا ہو جاتا ہے......غصہ تو اسے پہلے کبھی آتا نہیں تھا۔ لیکن یہ یکایک اسے اتنا غصہ کیسے آجاتا ہے۔

اس کے بعد بھی عبدل چپ نہیں بیٹھا۔

اس نے ٹیسن پر قلی گیری بھی کرنا چاہی۔ مگر بیچ والے قلیوں سے اس کی کہا سنی ہو گئی۔ اور کسی نے اسے مسافروں کا سامان چھونے تک نہیں دیا۔

وہ حیران تھا کہ آخر اشرف پیسہ کیسے کما لیتا ہے...... وہ تو جہاں جاتا ہے اس کی لڑائی ہو جاتی ہے۔

لمبے چوڑے ہاتھ پاؤں دیکھ کر اسے ٹھیلے پر سامان ڈھونے کا ایک کام ملا۔ اسٹور سے سامان لے اسے مارکیٹ میں پہنچانا ہوتا تھا، دو تین دن تک یہ کام ٹھیک چلا۔ شام میں جب تھکا ہارا خالی ٹھیلا لے کر وہ مالک کے پاس پہنچتا تو اس کی 'بہونی' ہو جاتی لیکن جیسے قسمت کو اس کے اچھے دن دیکھنے منظور نہیں تھے۔ ایک دن وہی پرانا

قصہ ہو گیا۔

تیز تیز ٹھیلا لے جاتے ہوئے وہ ایک بیل گاڑی والے سے ٹکرا گیا۔ کافی سامان سڑک پر بکھر گیا۔ کچھ کی پیکنگ کھل گئی — نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دوکان والوں نے سامان لیا ہی نہیں۔ باقی بچے سامانوں کو لے کر جب وہ مالک کے پاس پہنچا تو وہ کافی ناراض ہوا۔ جب اس نے بھونی کرنے سے انکار کیا تو عبدل کی غراہٹ نکل گئی۔

بدلے میں مالک نے اسے دھکہ دے دیا۔ اسٹور میں ہی کام کرنے والے دو تین مزدور مالک کی شہ پر اسے بری طرح پیٹنے لگے......

لوگوں کی بھیڑ لگ گئی......

ایسا شرمناک منظر عبدل کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ گھر آ کر وہ دیر تک اپنی چوٹوں کو گرم پانی سے سیکتا رہا۔ اب دھیرے دھیرے اس کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ وہ پیسے نہیں کما سکتا۔

یکایک پچھلے دروازے سے لمبی لمبی سانس لیتا ہوا اسلم گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ''بستی میں ٹینشن ہے......لوگ اپنی اپنی دکانیں بند کر رہے ہیں......''

''یا اللہ......''

عبدل نے گھبرائی ہوئی مہرن کو دیکھا۔ ''دروازہ بند کر دے رے اور چپ چاپ اماں کے پاس جا کر بیٹھ جا۔''

عبدل نے پاؤں کی چوٹ پر گرم کپڑے کا پھاہا رکھا۔ منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

''آہ......'' پھر آہستہ آہستہ وہ دوسری جگہوں کو سینکنے لگا۔

●●



## (۷)

ہنگامے کی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی......

اس کا مطلب تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ تیز تیز چیخنے چلانے کی آواز کچھ اتنی زیادہ تھی کہ مہرن دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

عبدل نے خوفزدہ نگاہوں سے اسلم کی طرف دیکھا جو نظر نیچی کئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشتری کچھ لمحہ دبی دبی آواز میں پکارتی رہی......

''اشرفو پانی......دے......''

''اشرفو......''

باہر چیخنے کا شور کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا......

یوں شہر کی فضا تو پچھلے کئی دنوں سے خراب چل رہی تھی لیکن معاملہ اچانک اس قدر بھی بگڑ سکتا ہے، کسی نے سوچا نہ تھا۔

مشتری نے پھر آواز لگائی تو عبدل دو قدم آگے بڑھ گیا۔

''کاہے چلاتی ہو......دو گھڑی چپ نہیں رہ سکتی......''

اسلم نے بدلے بدلے سے ابا کی طرف دیکھا۔ مہرن اب تک دروازے سے لگ کر کھڑی تھی۔ جیسے ڈر ہو کہ ذرا سے دھکے میں دروازہ ٹوٹ سکتا ہے اور اگر وہ دروازہ سے لگ کر کھڑی رہی تو دروازہ ٹوٹنے کا سوال ہی نہیں۔

ڈھم......ڈھام......ڈھم......

بازار میں توڑ پھوڑ مچ رہی تھی......عبدل نے ذرا دیر کے لیے سوچا — اس ملک میں یہ سب کیا ہونے لگا ہے۔ اس نے تو آزادی دیکھی ہے۔ آزادی کا جشن دیکھا ہے۔ کیا جس آزادی کے لیے سب اکھٹے مل کر لڑے تھے، کیا وہ ایسی ہی تھی۔ اب تو چاروں طرف آگ لگی ہے۔ اور یہ آگ جنگل جنگل، شہر شہر پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ اسے لگا — مشتری مر رہی ہے۔

اسے یاد آیا، کام کے بدلے ہر جگہ اس کے زخموں کو چھیڑا گیا ہے۔ ایک دن پہلے اس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا ہے۔ اس کا باپ غفار سامنے کھڑا ہے اور وہ چمڑے کا مشک باپ کے سامنے قینچی سے کٹی کٹی کر رہا ہے۔ ''مجھے نہیں



چاہئے......مجھے نہیں چاہئے......''

شور، چیخ، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے۔

عبدل نے پل بھر میں ایک فیصلہ لے لیا۔ اس نے اسلم کی طرف دیکھا۔ پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دروازہ سے لگی مہرن کو ایک طرف کھینچا۔

اسلم بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ ''دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔''

عبدل نے گھوم کر نہیں دیکھا۔ دیکھتا تو مہرن کی حیران پریشان آنکھیں نظر آتیں جو تعجب سے اس ہنگامہ کے عالم میں جاتے ہوئے ابا اور اسلم کو دیکھ رہی تھی۔

ان کے جاتے ہی ٹپ سے عزیز بھائی درزی والے کا بیٹا رفیق اندر گھس آیا۔

''تم......''

مہرن ایک دم سے چونک پڑی۔

''یہ کہاں گئے؟''

رفیق کے چہرے پر خوف تھا۔

''خدا جانے......''

''میں انہیں جاتے دیکھ کر آیا ہوں، مہرن حالات اچھے نہیں۔''

''یا اللہ۔ مہرن خوفزدہ ہوگئی......''

رفیق نے پوچھا۔ ''کچھ بتا کر تو گئے ہوں گے؟''

''نہیں کچھ نہیں، اچھے بھلے اچانک اٹھ کر چلے گئے۔''

رفیق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ابا چوک تک گئے تھے۔ بھاگ کر آئے ہیں۔

''وہاں تو لوٹ پاٹ مچا ہے۔ میں تمہیں دیکھنے چلا آیا......''

مہرن نے اتراتے ہوئے کہا۔ ''ابا اسلم کا کیا ٹھکانہ، تم جاؤ......''

اور سچ مچ اسلم کے نام سے رفیق بری طرح ڈر گیا۔ جیسے کسی نے بھوت کا نام

لے لیا ہو۔ وہ ایسے گھبرایا اور ایسے بھاگا کہ سر دروازے سے ٹکرا گیا۔ ایسے ماحول میں بھی مہرن کی ہنسی نکل گئی۔

''اوہ......''

رفیق کھسیانی ہنسی ہنسا۔ پھر دوڑتا ہوا چلا گیا۔ مہرن نے جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔ سڑک پر لوٹ پاٹ کا منظر تھا۔

بھگدڑ مچی تھی...... کچھ لوگ چلاتے ہوئے، بے ہنگم آوازیں لگاتے ہوئے دوڑے جا رہے تھے۔

عبدل نے اسلم کا ہاتھ پکڑا اور کنارے ہولیا۔

''ابا''، اسلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ آج ابا کے چہرے پر کوئی دوسرا ہی رنگ چڑھا تھا۔ یہ تو وہ پرانا عبدل مشک والا تھا ہی نہیں۔ کمزور سا، سب سے دب جانے والا۔

''ادھر آؤ۔''

عبدل نے اشارہ کیا۔ دونوں دیوار سے لگے سرکتے رہے۔ ایک طرف پولیس جیپ کھڑی تھی، لیکن پولیس تو تماشائی بنی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پولیس کا جوان مزے لے کر ہوا میں ڈنڈے بھانجنے لگتا ہے۔

لوگ بھاگ رہے تھے چلا رہے تھے۔ آج تک تو اس نے صرف سنا تھا کہ ایسے موقعوں پر پولیس دنگائیوں کا ہی ساتھ دیتی ہے۔ یہاں تو سارے منظر آنکھوں کے سامنے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگ لوٹنے کھسوٹنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دوکان کا تالا توڑ دیا گیا...... پھر ایک ساتھ لوگوں کا حملہ کتنی ہی دوکانوں پر ہو گیا۔

''بھاگو، مارو......''



جیسے جشن کا ماحول ہو، جیسے شہنائیاں بج رہی ہوں اور لوگ شہنائی کی آواز سن کر جھوم رہے ہوں۔

یہ کیا ہے......

یہ کون سی صدی ہے......

تہذیب کی کتنی صدیاں گزار چکے ہم......

لیکن یہ باتیں صرف گھر کی میز تک بھلی تھیں۔ کتابوں تک اچھی لگتی تھیں۔

''آؤ...... آؤ...... یہاں کھڑے ہو جاؤ......''

عبدل نے اسلم کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اسلم نے کافی دیر کے بعد ابا کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ابا ہم کیا کرنے جا رہے ہیں......؟''

''آں......''

عبدل نے جیسے کچھ بھی نہیں سنا...... وہ صرف ان لوگوں کو دیکھ رہا ہے جو لوٹی ہوئی دوکانوں کے سامان کو اپنا مال سمجھ کر بھاگے جا رہے تھے۔ عبدل نے داڑھی کے بالوں کو کھجلایا۔ آنکھوں میں ایک انوکھی چمک لہرائی، ایسی چمک جو شکار کو دیکھ کر لہراتی ہے۔

اچانک عبدل نے بیس بائیس سال کے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو دونوں ہاتھوں میں سامان کے پیکٹ لیے بھاگا جا رہا تھا۔

''اسلموا...... اسے گھیر......''

عبدل اتنے زور سے چیخا کہ سامنے آتا ہوا لڑکا یکایک گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹنے کی کوشش کرتا، دائیں طرف سے اسلم نے اور بائیں طرف سے عبدل نے اسے جکڑ لیا۔ لڑکا خوفزدہ ہو کر خود کو دونوں کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

''چلو سامان اٹھاؤ......''

عبدل نے حکم جاری کیا......

اور دونوں سامان کے بنڈل اٹھا کر تیز تیز گھر کی طرف لوٹ پڑے۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے عبدل ہانپ گیا تھا۔ دروازے پر زور سے دستک پڑی۔

گھبرائی ہوئی مہرن نے دروازہ کھولا۔

عبدل اور اسلم گھبرائے ہوئے اندر آ گئے۔

دونوں ہانپ رہے تھے۔ حیران و پریشان نگاہوں سے مہرن کبھی ان دونوں کو، کبھی سامان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

●●



# زندگی کے لیے......

## (۱)

اس کہانی کا ایک اہم کردار میں بھی ہوں— لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا، کہ اس داستان کو میری بھی ضرورت ہوگی۔ یوں حقیقت میں دیکھا جائے تو میری کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے بغیر یہ کہانی کچھ کچھ ادھوری سی رہے گی۔ میں نے عبدل مشک والے کو شروع سے ہی جس طرح دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، وہ میرے لیے کسی فنتاسی سے کم نہیں ہے۔ افسانوی ہیرو کی طرح اپنے خاص پہناوے میں اچانک نکل کر جانے کہاں سے میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ شروع سے ہی میری نگاہوں میں ایک فنٹاسی کردار کی طرح رہا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے اس کی باتوں میں مزہ آیا ہے...... اس کا ادھ ننگا جسم، اس کا دیو ہیکل بدن...... تھوڑی تھوڑی بڑھی ہوئی داڑھی...... چوڑے موٹے پاؤں...... لٹھ جیسے بال...... ان سطروں کو لکھتے ہوئے میں اس احساس سے دوچار ہوں کہ اچانک میری میز کے قریب ہی زمین پر عبدل کہیں سے نمودار ہو کر بیٹھ جائے گا...... پھر دھیرے سے کان سے نکال کر ایک بیڑی سلگائے گا...... میری طرف دیکھے گا......

''منا بابو......''

ساری دنیا جس وقت عبدل کو غلط نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، ایک میں تھا جو اس میں جدوجہد بھرے طوفان کو کھوج رہا تھا۔

آخر عبدل کو بھی تو بدلنے کا حق تھا۔

وہ مشتری جو اس کو جان سے عزیز تھی، صرف پیسوں کے نہ ہونے کی وجہ سے،

بے رحم وقت نے صرف دو سال کے چھوٹے سے وقفے میں اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ انسان بھی کتنا مظلوم ہوتا ہے۔ یہ تو وقت کے تھپیڑے ہوتے ہیں جو اس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔

میں عبدل کی زندگی کے ان صفحات کو بھی جانتا ہوں، جہاں میری نظر میں ایک نہایت معصوم کردار گھوم جاتا ہے — ان دنوں سے بھی متعارف ہوں، جہاں صرف اس کے خیال سے دوسرے لوگ خوف کھانے لگے تھے......

سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی غلط نہیں سمجھا۔ نہ ہی میں اسے غلط سمجھنے کی بھول کر سکتا ہوں۔

میری تعریف۔؟

شاید میری تعریف پر آپ کو یقین نہ ہو۔

میں اسی چودھری خاندان کے وارثوں میں سے ہوں، جہاں عبدل نے غلامی کے دن گزارے ہیں۔ جب سے آنکھیں کھلی ہیں تب سے اس ڈیل ڈول والے عبدل مشک والے کو دیکھ رہا ہوں۔ بچپن میں میری آنکھوں کے لیے یہ منظر تھوڑا عجیب سا ہوتا۔ پہلوان جیسا ایک آدمی کمر سے چمڑے کا مشک باندھے، مشک کے منہ کو ہاتھوں سے پکڑے پانی اچھالتا چلا آ رہا ہے...... گھڑے بھرے جا رہے ہیں...... کبھی ٹب بھر رہا ہے...... چمڑے کا مشک مجھے بکرے کے جسم کی طرح لگتا ہے، جسے عبدل نے اپنے جسم میں باندھ رکھا ہو۔

اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر شروع میں اسی لیے مجھے عبدل سے ڈر بھی لگتا تھا۔

کہتے ہیں چودھری کا خطاب انگریزوں کا دیا ہوا تھا۔ میں نے جس وقت آنکھ کھولی، چودھریوں کی آن بان، شان کا جنازہ اٹھ چکا تھا...... صرف وہ کہانیاں باقی تھیں جہاں دینے والے اور بانٹنے والے ہاتھوں کے تذکرے تھے...... جہاں حسن



وشباب کی داستانیں تھیں، جہاں خوشی اور انعام میں سب کچھ لٹا دیئے جانے کے قصے تھے۔ ایسے ایسے قصے جنہیں سنانے بیٹھوں تو یہ کہانیاں کبھی ختم نہ ہونے والی داستان بن جائیں۔ آج جنہیں سن کر طبیعت خوش نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کا غصہ امڈتا ہے...... کیسی کیسی داستانیں اور کیسے کیسے ان داستانوں کو سنانے والے لوگ......

وقت ساری داستانوں کو گم کر دیتا ہے...... چودھری خاندان نے اگر بلندی دیکھی تھی تو میری پیدائش کا زمانہ چودھری نسل کی تنزلی کا زمانہ تھا، جب چھوٹے کہے جانے والے لوگ بڑے بنتے جا رہے تھے — تجارت میں ترقی کر رہے تھے، عالیشان گھر بنا رہے تھے، بینکوں میں پیسے بھرے جا رہے تھے۔

اور یہاں......

میں چودھری رشید کا دوسرا بیٹا...... میں اس بات کا گواہ ہوں کہ بینک میں پیسوں کا ہونا تو دور کی بات، مہینے کے آخر دن ہوتے ہی پیسوں کے لالے پڑ جاتے تھے۔

شان تو کب کی ختم ہو چکی تھی...... صرف ابا کی باتوں میں زندہ تھی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ میری پیدائش جس زمانہ میں ہوئی، اس وقت سیکولرزم کی ہوا چل رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ہم سب نئی نئی تبدیلیوں کا دھواں پی رہے تھے۔

اب نوابیت سے چڑھ ہوتی تھی، رسم و رواج توڑنے کا دل کرتا تھا۔ میرا ایک شوق لکھنا بھی تھا۔ شاید اسی لیے عبدل کی طرف میرا جھکاؤ ہوا تھا۔

مجھے اس کردار سے پیار تھا۔

اس کردار سے ہمدردی تھی۔

''منا بابو۔''

پتہ نہیں کیا تھا، پانی بھرتے بھرتے جب وہ تھک جاتا تو میرے کمرے میں آ کر کھڑا ہو جاتا۔

اس کی آنکھیں میری کتابوں پر پھیل جاتیں۔

''محفوظ بھیا''

وہ میرے دادا کے بارے میں کہتا۔ ''بہت بڑے وکیل تھے وہ بھی ایسے پڑھتے تھے۔

''منا بابو'' وہ کان سے بیڑی نکالتا۔

میں منع کرتا...... ''بیڑی موت پیو، مجھے دھواں برا لگتا ہے۔''

''بس ایک پیوں گا۔'' اس کے چہرے پر بچوں کی سی مسکان ہوتی۔ ''پینے دونا......''

ذرا ٹھہر کر وہ کہتا۔ ''افسر بن جانا تو میرے بچے کو کہیں نوکری لگوا دینا......''

''بدھو'' مجھے لگتا میں زور زور سے ہنس پڑوں گا۔ میں اس کے چھوٹے لڑکے اشرف سے بھی چھوٹا تھا......اور عبدل میرے آفیسر بن جانے کی راہ دیکھ رہا تھا۔

میں مسکرا کر کہتا۔

''تم ابا سے کیوں نہیں کہتے؟''

''بھیا سے کہا ہے۔ بار بار کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تم ہی کہہ دونا......''

اس وقت گھروں میں چاپاکل اس طرح عام نہیں ہوئے تھے۔ کم از کم ہمارے محلے میں نہیں۔ یہ آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہوگی۔ اس وقت نہ میں نے سوچا تھا، نہ عبدل نے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دو چار سالوں میں ہی پانی کی قلت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ دو چار سال کے وقفے میں ہی عبدل کی ضرورت ہمارے گھر سے ختم ہوگئی۔

کہنا چاہئے کہ عبدل بے کار ہوگیا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے، جب گھر پر چاپاکل (ہینڈ پائپ) گاڑا جا رہا تھا......اور



عبدل ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی عزیز کی میت دیکھ رہا ہو......پھر بھی آواز میں اس نے ابا سے پوچھا تھا۔ چودھری صاحب...... جب اس کو کچھ خاص کہنا ہوتا تھا تو وہ ابا کو چودھری صاحب ہی کہتا تھا۔ چودھری صاحب۔ عبدل کی آواز سہمی سہمی تھی...... میں کہاں جاؤں گا چودھری صاحب......''

''تم آتے رہنا۔''

مزدوروں نے چاپاکل سے گندے پانی کی دھار نکال دی تھی۔ اب مزدور شور مچا رہے تھے۔ چاپاکل عبدل کو کسی خبیث کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''آتے رہنا......'' عبدل کی آواز لڑکھڑائی...... میں کہاں جاؤں گا۔ چودھری صاحب......میرا کیا ہوگا؟

''تم دیکھتے نہیں۔ ترقی ہو رہی ہے۔''

چودھری رشید نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب چھوٹے شہر بھی پانی اور بجلی کے معاملے میں خودکفیل ہونے لگے ہیں۔ ترقی ہوگی تو ایک چیز پرانی پڑے گی۔ ایک نئی آئے گی۔ دیکھتے نہیں، پہلے جوتے چمار سے خریدتے تھے، اب الگ الگ کمپنیاں آ گئی ہیں، نئے نئے ماڈل کے جوتے......''

''یعنی۔ میری ضرورت......''

یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے ڈاکٹر نے مریضوں کے رشتہ دار سے کہا ہو۔ ''بچنے کی صورت ایک فی صد بھی نہیں......'' تھکا ہارا عبدل جس وقت میرے کمرے سے گزر رہا تھا، وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔

مجھے اس نے دیکھا، لیکن آج اس کے چہرے پر کوئی چمک نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا تو یکا یک ایسا لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھیوں میں لے کر بھینچ دیا ہو......

''عبدل......''میں نے آواز لگائی۔

عبدل ٹھہرا، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں آنسو کے قطرے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔

''عبدل۔''

''منا بابو۔''اس کے ہونٹ کانپے۔''اب میری ضرورت نہیں رہی۔''

''ضرورت تو کل کسی چیز کی نہیں رہے گی عبدل...... زندہ تو صرف تاریخ رہے گی......''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''تم بدھو ہو...... چھوٹی سی بات نہیں سمجھ سکے۔ سنو پرانی تو ہر چیز ہوتی ہے عبدل...... جو آج نئی ہے، کل پرانی تو ہوگی ہی۔ پرانی ہوگی تو بیکار بھی ہوسکتی ہے۔ آخر انسان بھی تو بوڑھا ہوکر بیکار ہوجاتا ہے۔ کل تک تم مشک سے پانی بھرتے تھے، آج چاپاکل آیا ہے۔ کل سائنس کتنی ہی چیزوں کو پرانی کرکے نئی لے آئے گا۔ لیکن معلوم ہے۔ ایک چیز پرانی نہیں ہوگی۔ عبدل...... یہ تمہارے دو ہاتھ۔ یہ ہمیشہ نئے رہیں گے۔ پرانے پڑے تو سمجھو زندگی سے محبت ختم ہوگئی۔ انہیں پرانا مت ہونے دینا۔''

میں نے دیکھا۔ عبدل کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

''اب عبدل گھر جاؤ۔ ستالو...... آرام کرلو......''

آنسو پوچھتا ہوا وہ کمرے سے نکلا تو میرے دل میں سائنس کے لیے ایک چھوٹی سی کسک موجود تھی۔ ایجادیں کیوں ہوتی ہیں، کسی کو بیکار کرنے کے لیے؟ پھر ایک دن ان ایجادات کے دوڑ میں انسان تو صرف ایک مشین ہوگا۔

پھر عبدل نے گھر آنا جانا بھی کم کردیا۔ شادی پرب، تہوار کے موقع پر جب گھر کے افراد بڑھ جاتے تو اسے بلوایا جاتا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی آجاتا۔ مجھے اسے دیکھ کر رحم



آتا تھا۔ اس لیے کہ دھیرے دھیرے اس کے جسم نے گلنا شروع کردیا تھا۔ وہ پہلے والا عبدل نہیں رہ گیا تھا۔ ہر وقت مسکراتے رہنے والا عبدل......اب صرف خبریں ملتی تھیں...... مشتری بیمار ہے...... ٹی بی ہے۔ لڑکے ناکارہ نکل گئے۔ لڑکی جوان ہو رہی ہے۔ عبدل کو کسی کی فکر نہیں ہے۔

●●

یہ میری مجبوری تھی کہ میں اپنی کہانی کے اس ہیرو کو مرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک خبر ملی۔ عبدل نے چوری کرنا شروع کردیا ہے۔ وہ اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا ہے۔ رات گئے سونے کی زنجیر یا گھڑی چھین کر بھاگ جاتا ہے۔ پھر میں نے سنا کہ عبدل جیل چلا گیا۔ اس کے بعد عبدل کی ایک سے ایک خبریں میرے پاس پہنچتی رہیں۔ چوری کرنا اور جیل جانا جیسے اس کے لیے بہت ہی معمولی باتیں ہوگئی ہوں۔

یہ وہ دور تھا جب میں گھر کے باہر رہ کر اپنی پڑھائی کر رہا تھا۔ چھٹیوں کے موقع پر جب گھر آتا اور عبدل کے متعلق ان خبروں کو سنتا تو بڑا عجب سا لگتا ہے...... پہلے تو ان خبروں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچتا کہ ان تبدیلیوں کے ذمہ دار کچھ نہ کچھ حد تک ہم بھی ہیں۔

یہ میری پڑھائی کا آخری سال چل رہا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ میں نے ابا میں عمر کی حد چھوتی لکیروں کو کچھ زیادہ ہی گہرا پایا تھا۔ ابا اس دور میں داخل ہوگئے تھے جہاں پرانی باتیں کچھ زیادہ ہی یاد آیا کرتی ہیں۔ میں جب بھی ابا کے پاس بیٹھتا۔ ابا پرانی داستانیں کھول کر بیٹھ جاتے۔ آواز بھاری ہوجاتی۔

''یہ دینے والے ہاتھ رہے تھے میاں۔ اور اب کیسے خالی خالی...... وہ بھی کیا دن تھے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ باری بھائی...... اللہ بخش کا خاندان...... ابا کے

چہرے کی جھریاں کانپتیں۔ ان تذکروں سے ہوتے ہوئے ابا نامراد عبدل کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے۔

''پتہ نہیں بندے کو کیا ہوگیا۔ بڑھاپا غارت کررہا ہے۔ سنا ہے چوریاں کرتا ہے۔ کئی ایک دفعہ جیل بھی گیا۔ سنتا ہوں تو یقین نہیں آتا...... یہ وہی عبدل ہے جو شرمایا شرمایا ایک طرف بیٹھا رہتا تھا۔ آج لوگوں کو لوٹتا ہے، جیب سے پیسے چھینتا ہے۔''

●●

وہی ایک منظر......

ہاں یہ باتیں سن کر میں اسی ایک منظر کی زد میں ہوتا۔ عبدل پانی بھرنے آیا ہے اور اچانک ٹھٹھک گیا ہے۔ گھر میں چاپاکل گاڑا جارہا ہے۔ گندہ پانی زمین پر جمع ہورہا ہے۔ اس پورے منظر کو عبدل اپنی کانپتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

''یہ...... یہ کیا ہورہا ہے۔''

ایک ایک منظر میرے سامنے ہے۔ وہ میری امی کو 'بی بی' کہتا تھا۔ کبھی آج تک نگاہیں ملاکر بات نہیں کی۔ بس دور سے — بی بی پانی بھر دیا۔ بی کوئی اور کام ہے۔ اچھا چلتا ہوں بی بی...... امی جب خوش ہوکر پیسہ دیا کرتیں تو کیسا خوش ہوتا تھا عبدل، کیسی کیسی دعاؤں کی بارش کرتا تھا۔ امی کے انتقال کی خبر سن کر بھی عبدل آیا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر...... مجھے وہ پورا منظر یاد ہے۔ ہم چوکی پر بیٹھے تھے، ابا کے ساتھ۔ اور عبدل اپنے خاص انداز میں زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا...... ایسے موقع پر وہ ابا کو بھیا بولتا تھا۔

عبدل زاروقطار کسی چھوٹے سے بچے کی طرح رو رہا تھا۔

''بی بی ہمارا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ اب کون خیال رکھے گا۔ کتنا مانتی تھیں۔ پرب تہوار کے موقع پر بی بی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا تھا۔ بی بی خود ہی دھیان رکھتی تھیں۔''



ابا نے پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا تھا، عبدل کچھ کھالینا۔ عبدل کی بات سے ابا کی آنکھوں میں بھی کانپتے ہوئے آنسوؤں کو میں دیکھ رہا تھا۔

کتنی عجیب ہوتی ہے زندگی کی صداقت؟

اور حقیقت۔

سچ مچ ٹیڑھی میڑھی ان پگڈنڈیوں پر کون کیا سے کیا ہوجائے، نہیں کہا جاسکتا۔ وقت نے ابا کو بھی بدلا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں اب تسبیح کے دانے آگئے تھے۔ ہر وقت بولتے، مسکراتے ہونٹوں کو وقت کے زہریلے پرندے نے چپ کردیا تھا۔

●●

گرمیوں کی چھٹی میں گھر آیا تو عبدل کے افسانے سن سن کر خواہش ہوئی کہ عبدل سے ملا جائے۔ دستک کے بعد ہی دروازہ کھلا تھا۔ چہرے پر ایک عجب قسم کی سنجیدگی لیے عبدل نے لمحہ بھر میری طرف دیکھا اور ایک پل کو وہی پرانی چمک اس کی آنکھوں میں لہرائی۔

''منا بابو''

اندر بلانے اور ایک ٹوٹی کرسی پر بٹھانے تک وہ دوبارہ اسی انداز میں لوٹ گیا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ضرورت کے حساب سے کتنی ہی بار عبدل کے گھر آیا ہوں۔ لیکن ایسی نحوست میں نے پہلی بار دیکھی۔ میں نے مہرن کے سہمے چہرے کو دیکھا۔ سوکھ کر کانٹا ہوئے اسلم کی طرف دیکھا جو جیل کی مار کھا کھا کر ایک دم سے سخت اور بے حس ہوگیا ہے۔ سیلن بھرے کمرے میں پڑی مشتری کی زندہ لاش بھی دیکھی جو مکھیوں کا نوالہ بن رہی تھی۔

''عبدل یہ سب......''

میں اب بھی اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا...... اس نے ایک ٹھنڈی

سانس بھری۔ میری طرف دیکھا۔ مہرن کو میرے منع کرنے کے باوجود چائے کے لیے بولا۔ پھر کہنے لگا ''یہ سب کیسے ہو گیا میں نہیں جانتا۔ مگر یہ سچ ہے کہ منا بابو میں چوریاں کرتا ہوں۔''

بغیر حیل وحجت کے اس نے اقرار کر لیا تھا۔ ''بھوکوں مرنے سے اچھا ہے — چھین کر دو روٹی کھا لینا۔''

''لیکن......''

''تم یہاں نہیں تھے منا بابو! اس لیے منہ مت کھلواؤ۔ میں نے سب کر کے دیکھ لیا۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پیسے کم ہو جاتے ہیں تو اسلم کو پکڑ کر مجبوری کے لیے نکل جاتا ہوں۔ روز اڈے پر نہیں جاتا، فائدہ بھی کیا ہے......

عبدل نے قہقہہ بلند کیا...... میں نے دیکھا، درد کی ایک لکیر اس کے چہرے پر دور تک کھنچ گئی تھی۔

''تمہیں برا نہیں لگتا۔''

''برا کل لگتا تھا، جب بھوکا مرتا تھا منا بابو۔ تب شرم لگتی تھی۔......اب......''

وہ ہنس رہا تھا۔

اس بیچ مہرن نے چائے رکھ دی۔ میں نے اس کے سوکھے پیلے پڑے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہاں، ویسا چہرہ، جیسا خوفناک آسیبی کہانیوں میں ملتا ہے۔ چہرے پر امنگ جیسی کوئی چیز نہیں۔

عبدل نے بتایا۔ ''مہرن پر جن کا سایہ ہے، ہر وقت چپ رہتی ہے......'' مگر پتہ نہیں کیا تھا میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجب سی خاموشی پڑھی تھی — ویسی خاموشی جیسی قبرستان میں ہوتی ہے۔

میں نے پھر عبدل کی طرف دیکھا جو چائے کی پیالی نچاتا مزے لے کر بتا رہا



تھا۔

''میں روز چوری تھوڑے ہی کرتا ہوں۔ ایک ہفتہ کا مال ایک ہی بار میں لے آتا ہوں۔ کل شرافت تھی تو کس کام کی تھی۔ آج سب ڈرتے ہیں...... بہت بدنام ہو گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے میری پیٹھ پیچھے لوگ مجھ پر تھوکتے بھی ہوں گے......تھوکیں، مجھے کیا جاتا ہے۔''

ٹھیک اسی وقت میں نے مشتری کی درد بھری آواز سنی تھی۔

''اشرفوا......''

میں نے ایک لمحہ کے لیے عبدل کے چہرے پر تکلیف کے نشان پائے تھے۔

''اشرف کہاں ہے؟''

''اس نے الگ مکان لے لیا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے۔''

''اس کے الفاظ میں نفرت کی بو بسی تھی ''سنا ہے کوئی گندہ کاروبار کرتا ہے۔ عبدل نے رازداری سے بتایا۔ اسمیک بیچتا ہے۔ اسمیک۔''

●●

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں تو مجھے واپس جانا پڑ گیا...... آگے کے حادثات میں نے واپس آنے اور سننے کے بعد جوڑے ہیں۔ اس لیے کہ دل میں ہزاروں طرح کے سوالات کلبلا رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کا احساس ہوا تھا وہاں۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، میں اس کردار کی کوئی آپ بیتی نہیں لکھ رہا...... صرف اس عجیب وغریب کردار کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے میں یہاں عبدل سے اپنے تعلق کی کہانی کو ختم کر رہا ہوں۔ اس بیچ مجھے ابا کا ایک دلچسپ خط ملا تھا کہ عبدل ان کے پاس آیا تھا— اس نے دھمکی دی تھی اور......

لیکن ٹھہریے، میں پورا واقعہ تفصیل سے آپ کو سناتا ہوں۔

## (۲)

عبدل غمگین رہنے لگا تھا۔ ایسا کیوں ہے، وہ خود نہیں جان رہا تھا۔لیکن جب گھر پر پڑے پڑے وہ کھاٹ توڑ رہا ہوتا تو ایک عجب طرح کی بے چینی اس کے وجود میں سما جاتی۔ اس بے چینی کی کچھ صاف صاف وجوہات بھی تھیں۔ جیسے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس سے ملنے والے دھیرے دھیرے اس سے کٹنے لگے ہیں، اس سے آنکھیں چرا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں یا اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چاہے خلیل میاں ہوں، مراری رکشا والا ہو، سمد یا سلامو بجلی مستری۔ محلے کا کوئی بھی آدمی اسے پسند نہیں کرتا، آج جو حالت ہے، کل نہیں تھی۔ کل تک سب سے رام رام یا دعا سلام تو ہو ہی جاتی تھی۔

لیکن آج اس کے وجود پر دھبے پڑے تھے۔

اندر ہی اندر یہ دھبے بدبو دے رہے تھے۔

اس زندہ لاش سے بھی زیادہ جو اس سیلن والے کمرے میں پڑی تھی اور اس کی بیوی کہلاتی تھی۔

آج وہ سب کے لیے نفرت کا کردار تھا۔ اس نے مہرن کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے گہری نفرت دیکھی تھی۔ مگر کیا سچ مچ وہ اس ذلت کا ذمہ دار ہے؟

اسے رہ رہ کر اشرف پر غصہ آ رہا تھا...... ہاں اشرف نہ ہوتا تو وہ دلدل میں اترتا بھی نہیں۔

پتہ اس دن فساد کی خبر سن کر اسے کیا ہو گیا تھا۔ اشرفوا...... تیری قبر میں کیڑے

پڑیں گے۔

ایک گندی سی گالی اس کے منہ سے پھوٹتی ——

اشرف اس بیچ کئی بار آیا...... پچھلی بار پورے تین مہینے جیل میں گزار کر آیا تھا۔ اشرف نے جم کر عبدل کی ہنسی اڑائی تھی۔

''کیوں آ گئے نااوقات پر، محلے میں بہت نام کمار ہے ہو۔''

اس نے سرخ سرخ جلتی آنکھوں سے اشرف کی طرف دیکھا۔

اشرفوا قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''کیوں۔ میری بات بری لگی کیا۔''

''نہیں......''

''لگنی بھی نہیں چاہئے۔ لیکن گھر کی حالت بتا رہی ہے، کوئی بڑا ہاتھ اب تک نہیں مارا۔''

''میں تیرا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ دوزخی، کمبخت، عبدل نے پھر گالی دی۔ اشرف ہنستا۔ ''غصہ کیوں ہوتے ہو۔ چوری پہلے ہی شروع کر دی ہوتی تو اب تک پختہ ہو گئے ہوتے۔ کیوں؟''

اس کا جی چاہا۔ س...... سالے...... کے تن بدن میں آگ لگا دیں، لیکن غصہ تھوک کر بولے......

''پختہ بنوں یا ناپختہ۔ تیرے سے مانگنے تو نہیں جاتا نا، چھینال کی اولاد......''

''یہ چھینال کس کو بولا......''

اشرف زور سے ہنسا۔

''تیری ماں کو......''

عبدل کو لگا، اگر وہ چپ نہیں رہا تو وہ اس کا خون کر دے گا۔ اشرف زور سے



زور سے ہنس رہا ہے۔ عبدل کی آنکھوں نے جیسے اچانک خون کے فوارے چھوڑ دیئے ہوں۔ ''س...... سالے کمینے......'' وہ اتنی تیزی سے اشرف کی طرف جھپٹا کہ دبلے پتلے اشرف میں اچانک خوف کی لکیریں گہری ہو گئیں...... عبدل نے اسے گریبان کے ساتھ ہی اٹھا لیا۔

س...... سالے...... کمینے...... ناخلف...... باپ سے بولنے کی تمیز نہیں تیرے کو...... چوری کے بارے میں الٹا سبق سکھاتا ہے...... گریبان پکڑ کر عبدل نے اشرف کو جھنجھوڑ دیا۔

کمرے سے نکل کر مہرن کے پورے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

عبدل کے ہاتھوں میں جیسے کرنٹ دوڑ رہا تھا......

''بتاؤں...... کون ہے اس کا ذمہ دار...... ناخلف بدذات...... کل بھوکا تھا لیکن گرا ہوا نہیں تھا۔ تو نے گرایا رے کمبخت۔ پیسے دکھاتا تھا۔ للچاتا تھا...... دیر رات...... چھینا جھپٹی کے بعد گھر آتا تھا...... تیرے سے ملی...... تربیت...... کتے...... ذلیل......''

اشرف کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ لرزتی آواز میں بولا۔

''ابا چھوڑو...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔ چھوڑو تم برا مان گئے۔''

''چھوڑوں......؟''

عبدل کی آنکھوں میں خون اب تک کم نہیں ہوا تھا۔

مہرن نے بھی ایک چیخ ماری...... ''چھوڑ دیجئے ابا۔ اور اچانک سلین دیتے کمرے سے ٹیپ بھر بجا۔

''اشرف......''

عبدل کی گرفت اچانک کمزور پڑ گئی۔ چہرے کی لکیریں بدل گئیں...... اشرف گریبان جھاڑتا ہوا، خوف سے پیلا پڑا، باپ کے بدلے چہرے کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ جو اس عمر میں بھی اس پر بھاری پڑا تھا......عبدل دوبارہ کھاٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد اشرف رکا نہیں۔ وہ فوراً ہی گھر کے پچھواڑے سے نکل بھاگا۔

لیکن بہت دنوں کے بعد مہرن نے ایک بہت عجب سا منظر دیکھا تھا۔ یہ منظر اتنا عجب تھا کہ پتہ نہیں کس احساس کے تحت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ باپ کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ دیکھتی ہی نہیں رہی بلکہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ کہ یہ سب کیا ہے...... باپ کے اندر کے زخم کیسے ہیں۔ جو اچانک ہی پھٹ جاتے ہیں۔

عبدل کے ہاتھوں میں وہی مشک تھا......انگلیاں اس مشک پر پھیل رہی تھیں۔

اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

●●



## (۳)

جب سے عبدل نے چوری چکاری شروع کی تھی، مہرن اور رفیق کا ملنا جلنا لگ بھگ بند ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دھیرے دھیرے اڑتی ہوئی یہ خبر عزیز بھائی کو بھی لگی تھی اور عزیز بھائی اسے پاگلوں کی طرح ہاتھوں، پیروں سے مارتے ہوئے اپنی دوکان ''ماڈرن ٹیلرس'' میں کھینچ لائے تھے— ''چل کٹنگ سیکھ۔ پڑھائی کا بہانہ کر کے گھر پڑا پڑا روٹیاں توڑتا ہے۔'' رفیق کی پڑھائی تو الگ چھوٹ گئی، ادھر دوکان سے باہر نکلنے کی صورت رات دس بجے کے بعد ہی نکلتی تھی۔ عزیز بھائی اسے ٹیلر ماسٹر بنانے میں جٹ گئے تھے۔ گاہکوں سے کیسے بات کرتے ہیں، ایک ماہر کاریگر کی طرح پینسل سے لائن کھینچنے اور قینچی سے کپڑا کاٹنے کے تمام گر اسے بتاتے تھے— وہ خوش تھے کہ ان کا بیٹا پڑھائی سے الگ ہو گیا ہے۔ یوں بھی اب پڑھائی میں پیسہ ہے کہاں۔ ان کی دوکان میں ایسے کتنے ہی لوگ آتے تھے جو سرکاری ملازمت میں اونچے اونچے عہدہ پر ہوتے ہوئے بھی پیسوں کے ہمیشہ محتاج بنے ہوتے ہیں۔

ایسی نوکری کس کام کی۔؟

ان کا سوچنا غلط نہیں تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی پیسوں کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ سب سے برا حال رفیق کا تھا۔ وہ مہرن سے ملنے کے لیے بے چین تھا، لیکن اس دن رفیق کو عزیز بھائی نے جب دو طمانچے جڑے تو اسے دن میں تارے نظر آ گئے۔

''پرزہ بازی کرتا ہے کمبخت — عشق لڑاتا ہے۔ ٹانگ توڑ دوں گا۔ چیٹر کر رکھ دوں گا۔ اس دو ٹکے کی لڑکی سے جس کا باپ بھائی سب چور ہے...... کمبخت تو چور کی لڑکی کو بیاہ کر لائے گا۔ گھر کی عزت کا کچھ خیال ہے کہ نہیں۔ قرآن قسم اگلی بار یہ حرکت کی تو اوپر سے نیچے تک چیر دوں گا کمبخت۔''

عزیز بھائی بات بات پر قرآن کی قسم کھاتے تھے — بات بات پر قرآن اٹھا لینے کی دھمکی دیتے تھے۔ اپنے اڑوس پڑوس کے حلقہ میں عزیز بھائی خلیفہ کہلاتے تھے۔ خلیفہ کہلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محرم کے موقع پر اپنے محلہ سے نکلنے والے تعزیہ کے وہ خلیفہ تھے۔

محرم میں خلیفہ کا ٹھاٹ دیکھنے میں آتا۔ تعزیہ کے ساتھ ساتھ گلے میں روپیوں والی مالا پہنے، پان کھاتے ہوئے مست ہو کر چلتے...... نگاڑے تیز تیز بجتے...... چھن...... چھنن...... نا...... چھن...... چھن...... چھننا...... نانا......

اور خلیفہ مسکراتے ہوئے نگاڑا بجانے والوں کا من بڑھاتے۔ خلیفہ نے رفیق کے عشق کا قصہ جب دوستوں سے کیا تو دوستوں نے سمجھایا۔

''خلیفہ لڑکے کی شادی کر دو۔''

''ابھی......''

''اب کب کرو گے شادی، بڑھاپے میں — لڑکا جب ہاتھ سے نکل جائے گا تب۔''

''لیکن وہ پڑھنا چاہتا ہے۔''

''ارے پڑھائی وڑھائی میں کیا رکھا ہے پڑھائی چھڑوا دو اور کام سے لگا دو، دیکھنا سدھر جائے گا۔''

اسی لیے جب رفیق کی پڑھائی چھڑوا دی تو خلیفہ کو اطمینان ہوا تھا۔ لیکن اب



رہی شادی کی بات، خلیفہ نے اس میں بھی دیر نہیں کی۔ نذیر ٹیلر ماسٹر کی لڑکی صبیحہ سے بات پکی کر دی۔ نذیر نے جہیز کے علاوہ لڑکے کو اپنی دوکان کھلوانے کے لیے نقد اچھی خاصی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ 'جنتری' دیکھ کر شادی کی تاریخ تک مقرر کر دی گئی۔

رفیق کو اس وقت تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ ایک دن دوپہر میں جب وہ کھانا کھانے گھر آیا تو نذیر ماسٹر کے یہاں سے سینی، پرتوں اور ٹوکریوں میں سج کر مٹھائیاں اور پھل آئے تھے۔

اتنے سارے پھلوں اور مٹھائیوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

''اماں۔ یہ کس لیے۔''

اور اماں نے جیسے توپ کا گولہ چھوڑ دیا۔

''تیری شادی ہو رہی ہے۔''

''میری......''

رفیق کو کاٹو تو خون نہیں، چہرہ ایک دم سے پیلا پڑ گیا۔

''مگر اماں میں یہ شادی نہیں کروں گا۔''

''چپ کر۔ ابا کو معلوم ہو گیا تو بھیجا باہر کر دیں گے۔'' اماں نے سینیوں اور ٹوکریوں کی گنتی کرتے ہوئے کہا۔

رفیق کی آنکھیں ڈبڈبائیں...... اندر تک جیسے گہری اداسی اتر گئی — آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا چھا گیا۔ وہ فوراً بھاگ کر مہرن سے ملنے گیا۔ مگر یہ کیا۔

پچھواڑے کی کواڑ بند تھی...... دو ایک بار اس نے منہ سے سیٹی کی آواز بھی نکالی۔ آگے کا دروازہ بھی دیکھا...... لیکن اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی...... رفیق کو محسوس ہوا اس کا دل ڈوبنے لگا ہے۔ اسی کشمکش میں اس نے پچھواڑے اور آگے کے کئی چکر لگا

دیئے۔لیکن مہرن نہیں آئی۔نہ ہی دروازہ کھلنے کی آواز ہوئی......

دودن پہلے ہی تو وہ مہرن سے ملا تھا۔اس وقت، دوپہر کھانے کے لیے وہ گھر بھاگ آیا تھا۔مہرن دروازے سے لگ کر کھڑی تھی، یا پتہ نہیں کیا تھا، کہ اس نے محسوس کیا، اسے دیکھ کر مہرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں......

''مہرن......''

آواز جیسے درد کے کتنے ہی حصوں میں منقسم ہوگئی۔اسے لگا، مہرن کے چہرے پر وہ پہلی والی مسکراہٹ نہیں ہے آج......

وہ دھیرے سے بولا تھا......

''کہیں بھاگ چلتے ہیں مہرن......''

وہ چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا...... تیری زندگی یہاں تباہ ہوجائے گی مہرن......''

''تیرے ابا چوری کرتے ہیں۔بھیا چوری کرتے ہیں......تیرے سے کوئی نہیں شادی کرے گا مہرن، چل بھاگ چلتے ہیں......''

''سوچ لینا......اچھی طرح سوچ لینا مہرن...... بعد میں اپنا فیصلہ سنا دینا۔''

وہ تیزی سے اتنا کہہ کر غائب ہوگیا۔

مہرن نے جس وقت دروازہ بند کیا، اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

رفیق کو محسوس ہوا، فیصلے کی گھڑی اب دور نکل گئی ہے۔پتہ نہیں مہرن نے کیا سوچا۔اسے مہرن کے فیصلے کا انتظار تھا۔

●●



## (۴)

اشرف کو اتنی سی بات تو معلوم تھی کہ باپ سے غصہ نہیں کرنا چاہئے۔لیکن باپ بھی کیسا...... جو خود بھی بھوکوں مرتا تھا اور گھر کو بھی بھوکوں رکھتا تھا......گھر میں کھانے کو دو وقت کی روٹی ملتی تو اس کا یہ حال تھوڑے ہی ہوتا......اشرف اس پوری بربادی کا ذمہ دار عبدل کو ہی مانتا تھا۔جب سے وہ غلط لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا، اس کی کایا بدلی تھی۔چھوٹی موٹی چوری چکاری کے بعد دھیرے دھیرے وہ چرس، اسمیک اور کوکین پر اتر آیا تھا۔

اس کا کام مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا تھا۔ایک دن یار لوگوں کے ساتھ گپ شپ میں اس نے بھی تھوڑا نشہ کرلیا۔پھر تو وہ دھیرے دھیرے نشہ باز ہوتا چلا گیا۔دبلا پتلا تو پہلے ہی تھا۔

اب چہرے اور جسم کی ہڈیاں تک جھانکنے لگی تھیں۔

عبدل کو مشتری کی صحت کو لے کر غم کھائے جا رہا تھا۔سارے محلے میں اس کا نام نہ نکلا ہوتا تو وہ کب کا یہ چوری چکاری چھوڑ بھی دیتا......لیکن اب تو وہ پوری طرح بدنام ہو چکا تھا۔

پیسے گھٹ جاتے تو وہ اسلم کو لے کر کسی خالی ویران جگہ شکار کی تاک میں بیٹھ جاتا۔ یہ جگہ یا تو ندی یا نہر پر بنی پلیا ہوتی یا کوئی ویران سی کم آبادی والی سڑک۔ تہبند کے اندر لپٹا ہوا ایک چاقو بھی ہوتا جو راہ گیر یا مسافر کو خوفزدہ کرنے کے کام آتا۔ راہ گیر جیسے ہی قریب آتا اسے اسلم گھیرتا اور عبدل اپنی چوڑی چھاتی پھیلا کر چاقو کا پھل آگے کر دیتا۔

''خبردار۔''

لیکن یہ عبدل کی بدقسمتی تھی کہ اب تک کوئی بڑا شکار اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔
عبدل عورتوں کو نہیں چھوتا تھا، لیکن اسلم کا قول تھا کہ دھندے میں مرد اور عورت کیا دیکھنا۔

اس لیے اس نے دھندے میں کسی کو بخشنا نہیں سیکھا تھا۔

خالی وقت میں کھاٹ توڑتے ہوئے بھی اس کا دماغ کوئی نہ کوئی پلان بنا رہا ہوتا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ مزاجاً اتنا ڈرپوک تھا کہ کوئی بھی کام اکیلے نہیں کر سکتا تھا۔

جیب میں جب پیسے کم ہو جاتے تو اسلم عبدل کو جگاتا۔

''ابا......''

''ہاں......''

''کل رات میں اماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''

''رات میں۔'' عبدل چونکا۔

''ہاں رات میں''

''پھر جگایا کاہے نہیں۔''

جگا کر کا ہوتا ہے۔ اماں اب ٹھیک ہے۔''

عبدل بھاگ کر بیوی کے پاس پہنچتا اور جب اس کی چل رہی سانسوں کو محسوس



کرتا تو دوبارہ لوٹ کر پوچھتا۔

''کیوں رے اسلموا۔ اماں کی دوائی ہے یا نہیں۔''

''دوائی تو ختم ہو گئی ابا۔''

''پہلے بتایا کیوں نہیں۔''

عبدل کی آنکھوں میں فکر کے بادل چھا جاتے......'' چل اٹھ...... دھندے پر چلتے ہیں۔''

پھر دونوں باپ بیٹے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے۔

اشرف کچھ بھی تھا، عبدل کا اپنا خون تھا— اشرف کے سوکھے بدن کو لے کر بھی اس کو فکر تھی۔ ''سالہ......نشہ باز......''

لیکن ان دونوں سے زیادہ اسے مہرن کی فکر تھی۔ مہرن جو زیادہ تر چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ وہ اکثر اسے بلوانے کی کوشش کرتا۔

''چپ کاہے رہتی ہے۔''

عبدل سوچتا۔ کوئی بڑا ہاتھ مارلے تو مزہ ہی آجائے۔ وہ آرام سے مہرن کی شادی کر کے چین کی بنسی بجائے، لیکن ایسی قسمت کہاں۔

مہرن سوچتی۔ جیسے اس کے خواب کانچ کی طرح اس حجرے میں چاروں طرف بکھر گئے ہوں۔

نا......وہ خواب نہیں پال سکتی......ایسے کسی خواب پر اس کا کوئی حق نہیں۔ جہاں ایک گھر کا خیال ہو......اور رفیق...... سلے سلائے ایک سے بڑھ کر ایک کپڑے پہننے کی تمنا کسی دیئے کی طرح بجھ گئی تھی۔ اس بیچ کتنی بار اس نے پچھواڑے سے سیٹیوں کی آواز سنی۔ رفیق بلا رہا ہے۔ اس نے کہا ہے وہ جلدی سے فیصلہ کر لے۔ لیکن وہ کیا فیصلہ کرے گی۔ رفیق کے گھر والے چور کی لڑکی سے تو اسے بیاہنے سے رہے۔

جب جیب گرم ہوتی تو اسلم اور ابا دونوں الگ الگ کھاٹ توڑ رہے ہوتے۔
لیکن آج معاملہ دوسرا تھا۔ صبح سے ہی چھت پر کوا کائیں کائیں بول رہا تھا۔ عبدل اور اسلم سویرے سویرے ہی روٹی اور ترکاری باندھ کر نکل گئے۔ مہرن کا دل آج صبح سے ہی تیز دھوپ میں دھڑک رہا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا۔ بھاگ جانے کے فیصلہ پر ہاں کردے گی۔

اور کیا ہوگا......؟

زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ وہ پکڑے جائیں گے...... پکڑے جائیں! وہ ڈرتی تھوڑے ہے۔ اس جہنم سے بہتر کوئی بھی زندگی ہوسکتی ہے۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جیسے برسوں کے برابر تھا۔

رفیق آگیا......

وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک گئی...... اور تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے رفیق ہی تھا۔

لیکن چہرہ مرجھایا ہوا۔ جیسے برسوں کا بیمار ہو۔

''سنو......'' رفیق نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا...... ابا نے میری شادی طے کردی ہے......'' اسے لگا وہ بے ہوش ہوکر گر جائے گی۔

''سنو......لیکن میں یہ شادی نہیں کروں گا......تمہیں میرا فیصلہ یاد ہے۔''

اور اچانک ایک حادثہ ہوگیا۔ اس کے گال پر ایک زوردار طمانچہ پڑا اور رفیق کا ہاتھ اشرف کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آگیا۔

''س......سالے عشق لڑاتا ہے۔ آئیں...... بول بیٹا......عشق لڑانے کے لیے یہی گھر ملا تھا تجھے......تو اندر جا رے مہرن، بدذات کہیں کی......ابھی اس لونڈے کی میں شامت بناتا ہوں......''



مہرن کو اشرف نے اتنے زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دروازے سے ٹکرایا۔ اور وہ چیخ کر ایک طرف جا گری۔ اشرف نے پرواہ نہیں کی۔ پاگلوں کی طرح اس نے دروازہ کھینچا اور رفیق کے چہرے پر کئی طمانچے رسید کردیئے۔

''جمعہ جمعہ چار دن کے درزی کے لونڈے، تیری مجنوں گیری چھڑاتا ہوں میں......چل......'' وہ اتنے زور سے گرجا کہ آس پاس کے دروازوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

''سالے جان سے ماردوں گا تیرے کو......''

اشرف نے جیسے لاتوں جوتوں کی بارش شروع کردی تھی۔

اڑوس پڑوس کی کھڑکیاں دروازے تو پہلے ہی کھل گئے تھے—لوگ جمع ہونے لگے۔ کچھ لوگ بیچ بچاؤ پر اتر آئے۔ لیکن اشرفوا کی آنکھوں میں جیسے کوئی حیوان اتر آیا تھا۔

''بول......سالے......''

بھیڑ میں سے کوئی بولا......ارے عزیز بھائی کو خبر کردو......!

خلیفہ کے گھر سے اس کی ماں بہنیں نکل کر گلی میں آگئی تھیں۔ سب مل کر اشرف کو کوس رہے تھے۔

''ارے مردار تیرے کیڑے پڑیں......

''تو دوزخ میں جائے، کھانے کو آنکھ کی پٹی ملے۔''

''بھٹیارن......رنڈی......میرے بھولے بھالے لڑکے کو پہلے بہکاتی ہے پھر بھائی سے پٹواتی ہے۔''

''ارے ان چوراچکوں کو کوئی محلے سے نکال کر باہر کرو۔ اللہ......''

''ہائے رے رفیق......ارے مت پیٹ ناس پیٹے......مت پیٹ کمبخت......''

گالیاں تھیں، کوسنے تھے اور چیخ پکار۔ گلی میں اچھا خاصہ تماشہ لگ گیا۔ رفیق کو لگا وہ زمین میں گڑ جائے گا۔

شلوار جمپر میں اتر پردیش کے گاؤں کی رہنے والی اس کی ماں خاص انداز میں ہاتھ ہاتھ ہلا ہلا کر اشرف کی سات پیڑھیوں کو کوسنے دے رہی تھی۔

''قبر میں کیڑے پڑیں...... تیرے...... تیرے باپ کے...... تیرے دادا کے تیرے پردادا کے......'' اچانک بھیڑ میں کسی نے چلا کر کہا......

''عزیز بھائی آ گئے۔''

''لو وہ خلیفہ آ گئے۔''

خلیفہ نے رفیق کی طرف خونی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تیرے سے گھر میں نپٹ لوں گا۔ پہلے اس سے نپٹ لوں۔'

آگے بڑھ کر خلیفہ نے اشرف کے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

''کیا رے گرہ کٹ۔ نشہ باز۔''

جواب میں اشرف نے ایک سڑی ہوئی گالی بکی اور تیزی سے ہاتھ کھینچ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔

''تیرے سے سمجھ لوں گا۔''

''ارے تو کیا سمجھے گا۔ اب میں سمجھوں گا۔''

خلیفہ اسے مارنے دوڑنے تو لوگوں نے روک لیا۔ خلیفہ چیختے چلاتے رہے۔

''دیکھ لوں گا۔'' کہہ کر اشرف تیزی سے گھر کے اندر بھاگ گیا۔

دھیرے دھیرے سڑک کی بھیڑ چھٹنے لگی۔

مہرن کو لگ رہا تھا جیسے سر بازار اسے ننگا کر دیا گیا ہو۔

●●



## (۵)

اسلم اور عبدل دھندے سے لوٹے تو آدھے راستے میں ہی انہیں یہ خبر مل گئی تھی۔ محلے میں پولیس آئی تھی۔ خلیفہ کا لڑکا رفیق، مہرن سے عشق جھاڑ رہا تھا۔ اشرف نے دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑا، پھر رفیق کو کھینچتا ہوا سڑک پر لے آیا۔ کافی مارا۔ خلیفہ نے پولس بلا لی، اشرف بھاگ گیا۔

''پھر؟''

''گھر پر مہرن اکیلی تھی، پولیس کو دیکھ کر مہرن رونے دھونے لگی۔''

''مہرن نے اکیلے پولس سے بات کی؟''

''وہ کیا کرتی۔ دوسرا کون تھا۔ وہ تو زار و قطار رونے لگی۔ پولیس دھمکی دے کر گئی ہے کہ دوبارہ محبت کا ناٹک کیا تو۔''

''اور؟''

''تم دونوں کو کھوج رہی تھی، تمہارے بارے میں خلیفہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا پورا خاندان چوری کا دھندہ کرتا ہے۔''

''نچلے افسر نے بتایا کہ تم سب کا نام پولیس ریکارڈ میں ہے۔ وقت آنے پر وہ

تمہارا ریکارڈ ڈھونڈے گی۔''

اسلم کو مہرن کی محبت والی بات پر غصہ آ گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ دوڑتے ہوئے گھر پہنچ جاتا اور مہرن کا گلا گھونٹ دیتا۔ سناٹے میں تو عبدل بھی تھا لیکن جلد بازی سے معاملہ اور بھی بگڑ سکتا تھا۔

اسلم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''میں چھوڑوں گا نہیں اسے۔''

''مار ڈالے گا۔؟''

''ہاں۔''

''واہ۔ پھر پھانسی پر چڑھ جائے گا۔''

''نہیں۔ بھاگ جاؤں گا۔''

''واہ کیا کام کی بات کہی ہے۔'' عبدل نے ٹھہر کر گمچھے سے پیٹ اور پیٹھ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ کمینی...... نام نکالتی ہے محلہ میں......''

''چپ کر...... پہلے کون ہم ناک والے تھے۔''

عبدل نے کان سے لگی ہوئی بیڑی نکالی اور پینا شروع کر دیا۔

●●

گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ ایک بار دستک دینے پر ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ مہرن نے ہی کھولا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جیسے گھنٹوں بیٹھ کر روتی رہی ہو۔ اسلم نے اندر گھستے ہی ایک ہاتھ جڑ دیا۔

''حرام...... جا......''

عبدل کسی دیوار کی طرح سامنے آ گیا پھر مہرن کو ایک طرف ڈھکیلتا ہوا بولا۔



''جا...... جا...... کام کر......''

ایک نظر مشتری پر ڈال کر اس نے اپنا بستر زمین پر بچھا دیا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر عبدل پورے معاملہ پر غور فکر کرنے لگا...... وہ جتنا سوچتا اتنا اسے مہرن پر پیار اور رحم آتا...... اسے لگا مہرن کو اپنی زندگی بنانے کا حق ہے۔ اس جھونپڑ پٹی میں اسے کیا ملے گا...... جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو اس نے بیڑی کو اپنے چوڑے ننگے پاؤں سے مسل ڈالا۔ پھر خود ہی چلتا ہوا مہرن کے پاس آ گیا، جو اب بھی آنسو بہائے جا رہی تھی۔

''مہرن۔''

اسے اپنی آواز خود ہی اتنی ہلکی لگی کہ وہ پہچان نہیں پایا۔

مہرن نے نظریں اٹھائیں۔

''سن مہرن۔''

دنیا بھر کا پیار سمیٹے ہوئے وہ مہرن کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا...... ''سن —— تو جہاں چاہے گی وہیں تیری شادی ہوگی رے۔''

اسے اپنے لفظ خود ہی انجان لگے —— مہرن کو لگا جیسے اندر تک ہمدردی کے انجانے تاروں سے وہ کانپ اٹھی ہو۔

''ابا......''

اس نے چونک کر عبدل کی جانب دیکھا۔ عبدل رکے نہیں۔ آنکھوں میں یوں ہی آنسو کے چند قطرے اتر آئے تھے۔ اسلم کھاٹ پر لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ لوٹتے وقت عبدل ایک لمحہ کے لیے اسلم کے پاس رکا۔

''سن اسلم''

تہبند موڑ کر وہ چارپائی کو پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

''میں نے سوچ لیا ہے۔''

''کیا؟''

''میں مہرن کی شادی کی بات کرنے جا رہا ہوں۔''

''کس سے؟''

اسلم چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''خلیفہ سے۔''

''معنے۔''

اسلم ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ابا پاگل ہو گئے ہوں۔

''دماغ خبطا گیا ہے آپ کا......''

''دماغ میرا نہیں، تمہارا اور اشرف کا خبطا گیا ہے۔'' عبدل کے چہرے کا تیور بدلا......

''آنے دو اشرف کو۔ اس سے بھی سمجھوں گا۔ کیا سمجھ کر مہرن اور رفیق کو مارا تھا۔ وہ ہوتا کون ہے؟'' بیٹا سمجھ کر کون سی میری خوشی کا خیال کیا ہے اب تک۔ مہرن کے عشق کا سنا تو بھائی پنے پر اتر آیا۔''

''اس نے غلط کیا کیا۔''

اسلم کی آنکھوں میں نفرت تھی۔

غلط۔ عبدل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیوں اپنی کمائی سے شادی کروائے گا مہرن کی؟ یا زندگی بھر اسے گھر میں رکھنے کا ارادہ ہے؟ کون سے گھر میں اپنی لڑکی دے سکے گا۔ وہ اپنی قسمت بنا رہی تھی۔ اور اشرف سالے نے۔''

عبدل نے تھوک نگلتے ہوئے ایک گندی گالی بکی۔ ''آنے دے۔''

اسلم فکر میں ڈوب گیا۔



لالٹین کی لو دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

مشتری پھر آہستہ سے بدبدائی۔

''اشرفوا......''

''اشرفوا......''

عبدل کمرے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ پیار سے بولے۔

''سو رہو۔ اور اچھی رہو مہرن کی اماں۔ دعا کرو لڑکی کی شادی کی بات پکی کر آؤں۔ تم بھی اچھی ہو کر ٹہلنے گھومنے لگو۔''

آخری لفظ پر خود ہی تکلیف محسوس کی عبدل نے۔ رہا نہیں گیا۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اپنے بستر پر لوٹ آئے۔

اسلم بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ابا نے غلط کیا کہا ہے۔ سچ مچ وہ لڑکے کے انتظار میں رہے تو مہرن ساری زندگی گھر میں بیٹھی رہ جائے گی۔ اور کون لڑکا اس سے شادی کے لیے حامی بھرے گا...... دینے کے لیے ہے ہی کیا اس کے پاس۔

دماغ میں چلتی ہوئی آندھی آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی۔ اب آہستہ آہستہ اسے مہرن پر پیار آ رہا تھا۔

اور مہرن۔ وہ تو جیسے اس آٹھویں عجوبے پر تعجب کر رہی تھی۔

کیا یہ وہی ابا تھے؟

نا۔ ابا اتنے بدل کیسے گئے۔؟

ابا کو اچانک یہ کیا ہو گیا۔؟

لیکن صبح کا شرمندہ کرنے والا منظر رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو لا رہا تھا اور وہ ان آنسوؤں کو روک نہیں پا رہی تھی۔

●●

## (٦)

عبدل صبح ہی صبح اٹھ گئے — نل سے پانی لائے۔ نہادھوکر بکس کھولا گیا۔ اس میں پینٹ اور کرتہ نکالا۔ اسلم سے چپل مانگی۔ بہت دنوں بعد شاید برسوں بعد کنگھی کو ہاتھ لگایا۔ بال سنوارے گئے۔ تب تک مہرن ابا کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

''خوش رہو بیٹی۔''

''یہ صبح صبح کہاں چل دیئے۔''

اسلم نے پوچھا— عبدل صرف مسکرا کر رہ گئے...... کچھ بولے نہیں۔ دھیرے دھیرے چائے پیتے رہے — یہ فیصلہ تو انہوں نے رات ہی کرلیا تھا۔ جیسے بھی ہو خلیفہ کو منانے کی کوشش کریں گے۔ روئیں گے۔ اللہ رسول کا واسطہ دیں گے۔ پھر سے نیک نامی کی زندگی شروع کرنے کا وعدہ کریں گے۔ اس پر بھی نہیں پسیجے تو پاؤں پکڑ لیں گے۔ لڑکی کی عزت اور آبرو کی بھیک مانگیں گے۔ آخر خلیفہ سے پرانی جان پہچان رہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ خلیفہ مان نہیں جائیں۔ کوئی آدمی کتنا بھی پتھر دل کیوں نہ ہو لڑکی کی عزت کا سوال آئے گا، تو ضرور راضی ہو جائیں گے۔

●●



آج صبح سے ہی مشتری کی طبیعت خراب تھی۔

مہرن نے بتایا تھا...... اماں کا بدن سرد ہے۔ پانی بھی حلق سے نہیں اتر رہا ہے۔

''اچھا......''

اس نے مشتری کی نبض ٹٹولی۔ زندگی کی حرارت دیکھی تو جان میں جان آئی۔ بڑھیا ابھی نہیں مرے گی۔ ایسا تو کتنی ہی بار ہوا ہے۔ پھر وہ ایک اچھے کام کے لیے نکل رہا ہے آج۔

پاؤں میں ہوائی چپل، ادھ ننگا سا پینٹ، سلیقہ سے کی گئی کنگھی۔

عبدل سچ مچ آج پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔

●●

خلیفہ کے دروازے پر خاموشی چھائی تھی۔ صبح کوئی ساڑھے سات بجے کا وقت ہوگا۔ دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ دروازہ پر دستک دینے سے پہلے ہاتھ ٹھہر گئے۔

کوئی انہونی ہوگئی تو؟

خلیفہ نہیں مانے تو۔؟

لیکن اندر کا یقین اتنا پختہ تھا کہ عبدل کچھ غلط نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ اللہ مہربان ہے، دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دستک دیں نہ دیں۔ نام لے کر پکاریں دل کی عجب کیفیت ہو رہی تھی۔

پھر دل پر جبر کر کے عبدل نے نام لے کر پکارا۔

''خلیفہ بھائی...... اے خلیفہ بھائی۔''

سڑک پر ابھی سواریاں چلنی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ عبدل کی آواز جیسے دور تک پھیل گئی۔

''خلیفہ بھائی۔اے خلیفہ بھائی......''

دروازہ کی کنڈی پر ہاتھ رکھا۔

کنڈی بجادی۔

آواز پھر لگائی۔''خلیفہ بھائی اے خلیفہ بھائی......''

پھر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری، لگا کوئی آرہا ہے۔عبدل سانس روکے آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔اوراچانک ٹھٹکے سے رہ گئے۔سامنے خلیفہ کھڑے تھے۔نہ دعانہ سلام۔آنکھوں میں اسے دیکھ کر غصے کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔

''تم۔تم''

خلیفہ غصے میں تھے......

''معافی مانگنے آئے ہوکیا......''

''خلیفہ بھائی۔جوہواسو۔''

اسے لگا، اس کے الفاظ میں جان نہیں ہے۔لفظ ٹوٹ رہے ہیں۔حالات وہ نہیں ہیں جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔

''تم کہتے ہو جوہوا بھول جاؤ۔دوبارہ اشرفوا اس محلے میں دکھائی دیا تو۔''

''نہیں دکھائی دے گا وہ خلیفہ بھائی......''

''ہوں......'' خلیفہ نے لمبی سانس کھینچی۔''اس نے رفیق کی سارے محلے کے سامنے پٹائی کی ہے۔ابھی ناسمجھ بچہ ہے وہ۔پولیس سے ایسی مرمت کراؤں گا اس کی کہ سات پشتیں یاد آجائیں گی۔''

''خلیفہ بھائی......''

''کل سے میرا خون کھول رہا ہے عبدل۔رفیق کی جو درگت میں نے بنائی ہے، سو بنائی پر ایک بات کہے دیتا ہوں۔یہ محلہ چھوڑ دو۔ورنہ۔'' خلیفہ زور سے گرجا۔



عبدل کو لگا جیسے امیدیں بالکل ختم ہوگئی ہوں۔آواز کمزور ہوگئی۔

''میں تو خلیفہ بھائی۔میں تو......''

خلیفہ نے ہوشیار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے عبدل میاں، آج تمہاری زبان تالو سے کیوں چپک رہی ہے۔تم تو دادا بن گئے ہو۔سب تم سے ڈرنے لگے ہیں۔''

''خلیفہ بھائی......''

عبدل کی آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو تھے۔''میں کیا تھا۔تم اچھی طرح جانتے ہو خلیفہ بھائی۔میں مشک والا تھا۔کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔اپنے کام سے کام رکھا۔سب اللہ کی مرضی۔''

''برے دھندے کرتے ہو اور اللہ کی مرضی کہتے ہو۔'' خلیفہ غصے سے بولے۔

عبدل نے پھر الفاظ اکٹھا کیے۔جتنے چاہے جوتے مارلو۔عزیز بھائی۔پر دل صاف کرلو، مہرن اور رفیق کی......''

ابھی لفظ ادھورے ہی تھے کہ خلیفہ سیڑھیوں سے لپکے۔

''کیا بولا۔تو شادی کردوں۔ای تو بولا۔''

وہ ٹھیٹھ خلیفائی زبان پر اتر آیا تھا۔

''اتنی زندگی گزار چکا تو۔تیرے کو عقل نہیں آئی رے۔چوراچکے کہیں کے۔تو میرے رفیق کا ہاتھ مانگتا ہے۔اپنی چھنال بیٹی کا۔تو آج ای کپڑے پہن کر آیا ہے میرے پاس—زندگی بھر تیرے بدن کو دوڈھوگت کا کپڑا نہیں مل سکا۔آج ای کسی کا اتارن پہن کر میرے رفیق کا ہاتھ مانگنے آیا ہے۔''

گریبان پکڑے پکڑے خلیفہ اسے سڑک پر لے آیا۔خلیفہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔اتنے زور سے کہ لوگ اکٹھے ہونے لگے۔

عبدل کو لگا جیسے یہیں، اسی جگہ اس کی قبر بن جائے گی۔ خلیفہ دوسرے لوگوں کو دکھا کر اشارہ کر رہے تھے......

''سنتے ہو بھائی لوگو۔ ای چوٹا اپنی لڑکی کی نسبت لے کر آیا ہے رفیق سے۔''

''سن رہے ہو سب لوگ۔ ای آیا ہے ای۔ جے کے بارے میں تم سب کو معلوم ہے—''

ہنگامہ شور شرابہ سن کر اسلم بھی گھر کی چوکھٹ سے نکل آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ باپ کو چھڑاتا خلیفہ نے اسے دھکا دیا۔ لوگ بھی خلیفہ کا ہی ساتھ دے رہے تھے۔

عبدل خاموش تھے۔ پتھر کے بت جیسے۔ وہ صرف ہنسی، قہقہے اور ٹھٹھول کی آوازیں سن رہے تھے۔ خلیفہ نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''جا۔ زندگی میں کچھ اچھا کرم کیا ہوگا—اسی لیے چھوڑتا ہوں تجھے......''

کپڑے جھاڑتے ہوئے خلیفہ گھر کے اندر چلے گئے۔ عبدل اسلم کا ہاتھ تھامے ہنستی ہوئی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ پاؤں میں طاقت نہیں تھی۔ اتنی شرم تو اسے جیل خانے میں بھی نہیں آئی تھی۔

''ابا......''

اسلم نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑا اور تیزی سے گھر کے اندر کھینچ لیا۔

●●



## (۷)

دو دن ہو گئے عبدل گھر سے باہر نہیں نکلے۔ پتھر کی موت کی طرح بس ایک ٹک دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ اسلم بھی کہیں باہر نہیں گیا۔ دو دنوں میں جیسے برسوں کے بوڑھے لگنے لگے تھے عبدل۔

یہی حال مہرن کا تھا۔ گھر میں لگتا تھا، جیسے موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔

اتنا گہرا سناٹا جس میں ایک ساتھ سب دفن ہو گئے ہوں۔

آج صبح سے ہی اسلم کی حالت خراب تھی۔ جیب کے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ وہ دو بار ابا کے پاس آیا۔

''ابا۔ دھندے پر نہیں چلنا ہے کیا۔؟''

عبدل کو لگا اس ذلت کے بعد جسم سے جیسے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہے۔ طاقت کہاں بچی ہے جو دھندے میں جائے۔ آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔

ان سب کا ذمہ دار عبدل نے مشک کو پایا تھا۔ اس لیے اس دن خلیفہ کی بے عزتی سہہ کر اس نے سارا غصہ مشک پر اتارا تھا۔ مشک کو قینچی سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ حالت

پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ اس پر بھی بس نہ چلا تو کٹے ہوئے چمڑے سمیٹ کر اس میں آگ لگا دی۔ کمرے میں چاروں طرف جلتے ہوئے چمڑے کی بو پھیل گئی۔

اس دن عبدل طبعیت بھر کر روئے تھے۔ لیکن اپنا آپ پھر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔

''ابا......''

اسلم نے آہستہ سے پکارا۔

عبدل نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا ہے؟''

''پیسے بالکل نہیں ہیں ابا......''

اسے لگا، اٹھ کر اسلم کو دو طمانچے لگا دیں۔ دو دن میں ہی اپنی تمام ذلت بھول گیا۔ کمبخت۔ خلیفہ نے کیا نہیں کیا— آخر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ نہیں، جب کام ہی نہیں تو اس کا قصور کیسا۔ اس نے رکشا چلانا چاہا— ٹھیلا گاڑی— بوجھ ڈھونا چاہا۔ بجلی کا کام سیکھنا چاہا۔

یہ ترقی کیوں ہوتی ہے۔؟

عبدل سوچ رہا تھا۔ اسی ترقی نے ہی اسے برباد کیا ہے— اس کی بربادی کی اصل ذمہ دار تو یہ ترقی ہے۔ کتنا اچھا تھا انگریزوں کا زمانہ۔ کتنی پوچھ تھی بھشتیوں کی۔ کتنی عزت کی جاتی تھی۔ اور اب سے بس کچھ دنوں پہلے تک— اسے مرحوم ابو بھائی کی یاد آئی جو کہا کرتے تھے۔ ''ہم تو پرانے ہو گئے عبدل بھائی اور ہم سے بھی زیادہ پرانے اور بیکار ہو گئے ہمارے پیشے۔ کون پوچھتا ہے ہمیں، سب یہی کہتے ہیں۔ کوئی نیا کام کیوں نہیں کرتے— لیکن اس بڑھاپے میں کوئی نیا کام کیسے سیکھوں۔ ان ہاتھوں کا کیا کروں، جس نے گھوڑے کو چابک مارنے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں۔''

لیکن اسے لگا، وہ کہے۔ ابو بھائی، تم سچ نہیں کہتے تھے— ہم چابک مارنے کے علاوہ بھی کچھ سکتے تھے، لیکن ہم تو چابک کے غلام ہو گئے تھے۔



ہم چابک کے غلام نہ ہو گئے ہوتے تو کچھ ضرور کر سکتے تھے۔

ابو بھائی کی یاد نے آنکھوں کو نم کر دیا تھا— ہاں ایک راحت ملی— ان کے بچے نے تین پہیا چلانے کی ٹریننگ لے لی تھی اور اب وہ تین پہیا چلاتا تھا— ابو بھائی کا تانگہ اس نے سستے داموں میں بیچ دیا تھا۔

●●

دس بجتے بجتے مشتری کی حالت بگڑ گئی— مہرن روتے ہوئے آئی۔

''ابا۔ اماں نہیں بچے گی۔''

اسلم آیا— ''ابا دھندے پر۔''

عبدل نے اسلم کی طرف دیکھا تک نہیں۔

مہرن سے بولے۔ ''تو سورہ یسین پڑھ۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اور یہ چودھری رشید کی بیٹھک تھی۔ وقت کے ساتھ کتنی بدل گئی تھی کوٹھی۔ یہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس نے کوٹھی کی، شان کا دور دیکھا تھا۔ اور اب جیسے چپے چپے پر گہری اداسی کا خیمہ لگا تھا۔

چودھری رشید کو جیسے اس کے بارے میں ایک ایک بات معلوم تھی۔ اس لیے وہ پہلے کی طرح اس کی آمد پر خوش نہیں ہوئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''سرکار......''

منت کرنے والے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جڑ گئے۔

''برسوں خدمت کی ہے آپ کی سرکار۔ مجھے معاف کر دیجئے— خاندانی غلام رہا ہوں آپ کا۔''

چودھری رشید نے طنز کیا۔ ''آج کیسے یاد آئی ہماری۔ نشانے پر کہیں ہمارا گھر تو

نہیں ہے آج......''

''سرکار۔''اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''سنا ہے خوب پیسے بٹور رہے ہو۔تینوں باپ بیٹے مل کر دھندا کر رہے ہو۔''

''سرکار۔''اس کی آنکھوں میں جھڑی لگی تھی۔

''یہ رونا دھونا کس لیے، جاؤ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔''

''مشتری مرجائے گی سرکار۔''

''میں نے کوئی ذمہ لیا ہے۔''

بس اسی لفظ سے کھول گیا عبدل — اسے لگا کوئی ذلیل سی گالی دے دی ہو چودھری رشید نے۔اس کی بھنویں تن گئیں۔

''ذمہ تو تمہیں لینا ہی پڑے گا چودھری — اتنے برسوں جو خدمت کی ہے تمہاری — مشتری کا علاج کروانا ہے۔ مجھے کچھ پیسے دیدو۔ واپس کر دوگا، چودھری۔''

چودھری رشید کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''دھمکی دے رہے ہو مجھے۔''

چودھری رشید حلق پھاڑ کر چیخے۔دھکا دیا اسے۔''نکل جا بدبخت، میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔''

عبدل کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔یہ اس نے کیا کر دیا۔چودھری کے سامنے تو وہ کبھی ٹھیک سے سر اٹھا کر بولنے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اور یہ آج۔

عبدل گھر لوٹا تو مشتری کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

●●



## (۸)

کمرے میں لوبان کی مہک پھیلی ہے۔

مہرن نے پورے کمرے کی صفائی کی۔پانی سے دھویا۔کھاٹ خالی ہے اور اس پر کسی کا وجود نہیں۔اب رہ رہ کر کوئی گھسا ہوا ٹیپ نہیں بجتا۔

عبدل کھاٹ پر سر دیئے زمین سے لگ کر بیٹھا ہے۔کمرے میں سیلن اب بھی بھری ہے۔دیوار پر ہزروں چیونٹیاں قطار باندھے چڑھ رہی ہیں۔

عبدل کی آنکھیں شاید کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہی ہیں — اور دیکھ پانے کو بچا ہی کیا ہے؟

کمرے میں پیشاب کی بو اب بھی باقی ہے۔

اندر سے کوئی انجانی سی آواز سر اٹھاتی ہے — عبدل تم تھک گئے ہو۔تمہاری زندگی ایک بے مقصد دائرے میں گھومتے گھومتے تھک چکی ہے۔

اسے لگا، اسے اس سیلن اور بدبو سے باہر نکلنا چاہئے۔اس کے گلے میں جو بدنامی کا طوق پڑ چکا ہے، اسے باہر نکالنا چاہئے۔

اسے تسلی نہیں، کسی کا انتظار ہے۔

اسی اٹھنگے ، پھٹے تہبند میں، اس کی آنکھیں مسلسل دروازہ سے لگی ہیں۔ تین چار دن گزر گئے۔

لیکن اشرف نہیں آیا۔ آخری وقت تک مشتری کے کانپتے ہونٹوں پر بس یہی ایک لفظ تھا۔ ''اشرفوا—'' کتنا پیار کرتی تھی اس کو مشتری— کتنا مانتی تھی۔ عبدل گہرے سناٹے میں ہے۔ اور سناٹے کی جھنجھناہٹ لگاتار کانوں میں بجتی جارہی ہے۔

''تم کہتے ہو۔ تم جیتے ہو۔ تم جانتے بھی ہو جینا کیا ہوتا ہے۔ تم نے چودھریوں کے یہاں غلامی کی ہے۔ اور انہوں نے پشت در پشت غلامی کا صلہ یہ حجرہ دیدیا ہے تمہیں۔''

''بس یہی حجرہ تمہاری آج تک کی خاندانی غلامی کی کمائی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے تم۔ کوڑھ پھوٹ چکا ہوتا تمہیں۔ جانتے بھی ہو، کمائی کیسے کی جاتی ہے۔''

''ایک پھٹا ہوا مشک ہے تمہارے پاس۔ جسے آج دوروپے میں بھی کوئی نہیں خریدے گا۔''

اور چانک وہ ٹھہر گیا ہے۔

مشتری کے مرنے پر بھی خون روتی یہ آنکھیں اتنی سرخ نہ ہوئی ہوں گی، جتنی کہ اب ہوئی ہیں۔ لبالب خون سے بھری ہوئی۔ زمانے بھر کا سارا زہر جیسے ان آنکھوں نے پی لیا ہو۔

اس نے دیکھا، نشہ بازوں کی طرح لڑکھڑاتا، اشرف کمرے میں داخل ہوا۔

داڑھی بڑھی ہوئی۔ چہرہ کی ساری ہڈیاں جیسے باہر نکل آئی ہوں— جیسے اسے قطرہ قطرہ چوس لیا گیا ہو، پاؤں میں ایک ٹوٹی ہوائی چپل، گندا سا تنگ پینٹ اور ایک



پھٹا میلا شرٹ—

''اماں......''

نشے سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھی...... وہ ٹھیک سے سیدھے کھڑا نہیں ہو پارہا تھا۔

ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دیکھتے ہوئے اس نے عبدل کی طرف دیکھا۔ جہاں نفرت کی ہزاروں ندیاں مل کر سمندر کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

''اب......ابا......''

اشرف کے لفظ لڑکھڑائے۔ لیکن عبدل کے کانوں میں صرف وہی جھنجھناہٹ بجے جارہی ہے۔ اور ایک میلا سا منظر۔ شہر میں لوٹ پاٹ مچ رہی ہے۔ دوکانوں کے تالے توڑے جارہے ہیں۔ اسلم کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔

اور پہلی بار۔

ہاں پہلی بار۔ زندگی کی اس لڑائی میں ہار کر اپنا ہاتھ میلا کر لیتا ہے۔

اس نے تہبند کی گرہ میں سے چاقو نکالا ہے— وہی تیز دھار والا چاقو۔ چاقو کا چمکتا ہوا پھل۔ یہ ہی چاقو ہے، جسے دکھا کر مسافروں اور راہ گیروں کو اس نے لوٹنا سیکھا تھا۔

''نہیں۔'' اشرف کی آنکھوں میں خوف تیر گیا ہے۔

چاقو لے کر عبدل کسی خطرناک فیصلے کے تحت آہستہ آہستہ اشرف کی طرف بڑھ رہا ہے۔

# صبح



## (۱)

عبدل کی کہانی ختم ہو چکی ہے۔

پتہ نہیں، کتنا عرصہ گزر گیا لیکن میرے کانوں میں اب بھی عبدل کی آواز سرگوشیاں کرتی ہے۔

’’منا بابو۔‘‘

اچانک احساس ہوتا ہے۔ عبدل چپ چاپ آکر میری میز کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا ہے۔

’’منا بابو۔ جب آپ آفیسر بن جائیں گے۔‘‘

میں دیکھتا ہوں وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی آواز نہیں سن پاتا۔

یہ وقت کا تقاضا ہے کہ چہرے اوجھل ہونے لگتے ہیں۔ یادیں دھیرے دھیرے سونے لگتی ہیں۔ میرے دل میں اب بھی بہت سارے سوالات تھے، مہرن کا کیا بنا، رفیق کی شادی ہوئی یا نہیں۔ اسلم نے کون سا دھندہ اپنایا۔

لیکن ان سب سے بھی، یعنی ان جذباتی وادیوں سے دور بھی ایک سچ ہمارے انتظار میں ہوتا ہے۔ جو کہتا رہتا ہے۔ عمر کی کتنی صدیاں گزار چکے تم؟ تم کو کچھ اپنے

لیے بھی کرنا ہے۔ کچھ بننا ہے۔ وقت کی اس صداقت کو تسلیم کرنا ہے کہ وقت ہر حال میں اپنا سفر طے کرتا رہتا ہے۔

یہ عبدل کی دعائیں تھیں کہ میرے وجود پر آفیسر کا ٹیچ لگ گیا تھا......

ٹریننگ ختم ہونے کے بعد جب گھر لوٹا، تو یکا یک، شاید پہلی بار بڑا عجیب سا احساس ہوا۔ ابا کی پرانی داستانیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ تب کوٹھی میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ یہ ہمیشہ دینے والے ہاتھ رہے تھے۔ لیکن وقت کی دوڑ میں یہ دینے والے ہاتھ بہت پیچھے رہ گئے اور بقول ابا، جو لوگ کل تک سر اٹھانے کی بھی ہمت نہیں رکھتے تھے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہاں تو ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ابا کے وجود میں ایک داستان گو آدمی سامنے تھا۔ سمندر کا بوڑھا آدمی — وقت نے کوٹھی میں کتنے ہی پیوند لگا دیئے تھے۔ اور یہ پیوند مجھے سینے تھے۔ اس لیے کہ ابا کے خیالات اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں جان رہا تھا، اگر کوئی شئے پرانی ہو جائے، اسے جب تک وقت کے ٹکسال میں نہیں ڈھالا جائے اس کی قیمت نہیں بڑھتی۔

میں نے کوٹھی کی طرف حقارت سے دیکھتی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

اور گھر کے پرانے وفادار عبدل کے مشک کی قدر و قیمت پہچانتا تھا......

شاید اس داستان کے ساتھ چل رہے کچھ تذکرے بھی ضروری ہیں۔ ہاں مجھے مہرن کا حال معلوم کرنا تھا۔ پہلا جھٹکا مجھے اس وقت لگا، جب معلوم ہوا کہ خلیفہ کی سختی کے باوجود ایک رات دونوں گھر سے فرار ہو گئے۔ مہرن کے لیے اب اس گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ہر آدمی کو اپنے لیے ایک اچھی زندگی چننے کا حق ہے۔ وہاں۔ قبرستان جیسے اس حجرے میں مہرن کے واسطے تھا ہی کیا اور صرف گزار لینے کا نام زندگی نہیں۔ جب تک اس میں محبت نہ ہو۔ قوس وقزح کے رنگ نہ ہوں۔ مہرن نے اپنی طرف سے



ایک لڑائی لڑی تھی۔ لیکن کیا ہوا۔ یہ بدقسمتی ہی تھی کہ دونوں پکڑے گئے۔ رفیق اسے بھگا کر اپنے ایک دوست کے یہاں لے گیا تھا۔ جہاں خفیہ طور پر ان دونوں کے بیچ خلا ہو گیا...... چار ماہ دس دن کی عدت گزارنے کے بعد مہرن اسی حجرے میں قید تھی۔

دنیاوی خوشی اس کے لیے صرف خواب بن کر رہ گئی تھی۔

●●

## (۲)

لیکن یہ سب میں کیوں لکھ رہا ہوں۔

کہانی تو کب کی ختم ہوگئی۔لیکن شاید نہیں۔ابھی ایک چھوٹی سی کہانی اور ہے۔ جسے نہیں سنا سکا تو عبدل کی یہ داستان ادھوری رہ جائے گی—

میری ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اور مجھے اپنی ملازمت جوائن کرنے کے لیے صبح ہی گاڑی پکڑنی تھی۔ابا سے سلام دعا کر کے میں باہر آیا۔ہاتھ میں بریف کیس تھا اور آنکھیں اسٹیشن چلنے کے لیے رکشہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

یکا یک مجھے ایک نوجوان رکشا والا نظر آیا۔

''ارے رکشہ والے......''

میں نے آواز لگائی......

''اسٹیشن چلو گے......''



رکشہ والے نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔اور میں جیسے سناٹے میں آ گیا......

رکشہ والے نے بھی میری طرف چونک کر دیکھا۔

میرے منہ سے یکا یک نکلا......

''اسلم۔''

''ہاں۔جی......''

اس کی آنکھیں پرانی یادوں سے لبریز ہوئی تھیں۔

''آپ کو دیکھ کر ابا کی یاد آ گئی منا بابو۔ابا آپ کو بہت مانتے تھے۔بہت یاد کرتے تھے۔''

''لیکن یہ سب۔''

''کیا کہوں۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔آپ کو تو سب معلوم ہے۔ابا ایسے نہیں تھے۔انہیں ان کے مشک نے دھوکا دیا۔''

اس کی آنکھوں میں جلن تھی۔''ابا سمجھتے تھے جب تک مشک ان کے پاس ہے، برے دن نہیں آسکتے ان کے۔لیکن ایک دن مشک بیکار ہو گیا۔اور ابا نے اسے جلا بھی دیا۔''

''اشرف کو کیوں مارا؟''

اسلم نے نظریں نیچی کرلیں۔''کیونکہ برے دنوں کو وہ اشرفوا کا قصور مانتے تھے......اشرفوا کو مار کر ابا کو جیل ہوگئی۔اور جیل میں ہی ابا......''

اس نے آنکھیں پوچھیں......

''مہرن اب کہاں ہے؟''

''میرے ساتھ ہی جی۔''اس نے میری طرف دیکھا۔

''منا بابو۔ آپ بھی کوئی لڑکا دیکھئے نا اس کے لیے۔''

میں نے مسکرا کر حامی بھر لی۔ رکشے پر بیٹھ گیا۔ اسلم نے تیز تیز پیڈل مارنا شروع کیا۔ میں نے اسلم کے بازوؤں۔ ہاتھوں اور پاؤں کی سختی کا اندازہ کیا۔ ایک پل کو لگا، تصویر بدل گئی ہو۔ اسلم کی جگہ عبدل ہی ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہو۔ اور تیز تیز پیڈل مارتا جاتا ہو۔ مجھے لگا، اب عبدل میری طرف دیکھے گا اور کہے گا۔

''منا بابو۔ آپ صحیح کہتے تھے۔ پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں لیتی جا رہی ہیں۔ لیکن ایک چیز کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ یہ دو ہاتھ۔''

مجھے لگا، عبدل کی تبدیلی نئے طریقہ سے اسلم کی شکل میں ہوئی ہو۔

اور تب مجھے لگا— اجلی اجلی صبح کا اپنا جادو ہے۔ صبح کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔



# گردش ماہ وسال

ہاں
ہم تیار نہیں ہیں۔
اس طرح
بار بار
ذبح ہونے کے لیے



کہانی ختم ہو چکی ہے......

لیکن اپنے آپ سے منتھن کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے شاید۔ میں گھر گرہستی کے بندھن میں بندھ چکا تھا۔ اب ایلیشا تھی اور میں تھا اور زندگی کی ایک نئی کہانی تھی۔ کبھی کبھی ایلیشا کی فلسفیانہ باتوں میں زندگی کے تمام سرد و گرم بھول جاتا۔ اور وہ بس جیسے مجسم سوال بنی آنکھوں کے آگے چھوئی موئی پودے کے جیسی بیٹھ جاتی......

''ماضی کیوں کریدتے ہو؟''

''بس اچھا لگتا ہے؟''

''اس میں کیا ہے، سوائے تمہارے پریشان ہونے کے......''

''ماضی خود کا احساس بھی تو کراتا ہے۔ خود کو ٹٹولتے رہنا چاہئے ایلیشا! تواریخ کے گزرے پنوں کی گرد نہ جھاڑی جائے ایلیشا، تو تہذیب کے ایک حصے پر بھی گرد محسوس ہونے لگتی ہے۔''

''پاگل پن۔ بیوقوفی۔ صرف حال۔ حال میں کیوں نہیں جیتے ہم سب۔ صرف

جو ہو رہا ہے، اس میں — جو ہو چکا وہ برا بھی ہے تو بدلنے کا کیا حق ہے ہمیں؟ اور بدلا بھی تو نہیں جا سکتا۔ جو ہونے والا ہے وہ بے بنیاد تصور ہے۔ اور جو ہے، بس اسی میں جینا ہے۔ وہ جیسا بھی ہے۔ سچ وہی ہے...... کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ یہ تواریخ کی بوسیدہ کتابیں لے کر کیوں بیٹھ جاتے ہو؟''

کبھی وہ موڈ میں ہوتی تو زور سے ہنستی۔

''سنو، تمہیں ان فضولیات کے لیے اتنا سارا وقت کیسے مل جاتا ہے — شاید ہیگل نے کہا تھا۔ مجھے بھی دوسروں کی طرح زندگی کو بوجھل بنانا اچھا لگتا ہے...... اس سے دماغی کثرت ہوتی رہتی ہے۔ ناٹی بوائے۔''

''نہیں۔ فضولیات نہیں۔ کوئی پرانا کھنڈر اچانک ہمیں چونکا کیوں دیتا ہے۔ کوئی موہن جداڑو، ہڑپا یا ایسی کتنی ہی چیزیں۔ تاج محل اور دوسری حسین عمارتیں جن میں اب کوئی نہیں رہتا۔ پاگلوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں سیاح اور ماضی کی گرد جھاڑنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں آنکھیں۔ کچھ ہے ایلیشا۔ ہمارا حال اتنا سمٹا ہوا نہیں ہے۔ ماضی سے اس کا ایک رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جیسا بھی ہے۔ مگر ہے...... ہم اسے ان دیکھا کر کے......''

●●

ایلیشا — زندگی کی تہہ بہ تہہ سچائیوں کو ان دیکھا کرنے والی۔ وہ بس ایک پیاری سی جاپانی گڑیا تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت دریا کی موجیں جیسے کھلکھلا رہی ہوتیں۔ زندگی کے معاملے میں بس حال پر بھروسہ کرنے والی۔ کبھی کبھی آزاد، خودرو موج کی طرح گنگناتی کہیں دور چلی جاتی۔ میں اس کی غیر موجودگی سے سہم سا جاتا۔ اچانک گھر کا گوشہ گوشہ میری آواز سے لرز اٹھتا۔ ایلیشا...... ایلیشا...... اور ذرا دیر بعد اچانک کسی پراسرار گوشہ سے طلوع ہو کر وہ قہقہہ بکھیر دیتی۔



''اس طرح گھبرا کیوں جاتے ہو......''

وہ پاس میں بیٹھ کر پل دو پل میری آنکھوں میں دیکھتی، پھر کہتی...... ''اچھا مان لو میں گم ہو گئی تو، مجھے تواریخ کا کھنڈر تو نہیں بنا دو گے۔ بھول جانا مجھے — مجھے کھنڈر بننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

ایلیشا کا تذکرہ یوں ضروری تھا کہ اس کے بغیر میرے آج کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اونچا رتبہ، عہدہ، گاڑی، یہ سب کچھ تو جیسے ایلیشا کی رہین منت تھا۔

کوشش میری تھی مگر جیسے ایلیشا کی دعاؤں کا ثمرہ تھا۔

●●

رات گئے اچانک کمرے میں پرانی یادوں کا حملہ ہو جاتا...... زندگی کے صفحات تواریخ کی دھندلی فلموں کی طرح نگاہوں کے آگے چلنے، رینگنے لگتے...... اچانک کانوں کے پاس ایک تھرتھراتی سی آواز گونجتی......

''منا بابو...... جب ایک دن تم افسر بن جاؤ گے تو......''

میرے سامنے واسکوڈی گاما جیسا کھڑا ہو جاتا، عبدل...... مشک کی پٹی پیٹ سے باندھے۔

تقریباً ننگ دھڑنگ۔ لمبا چوڑا۔

''منا بابو۔''

آواز بار بار شب خون مارتی۔ ''تم سن رہے ہو نا منا بابو۔''

حال ایک دم سے، اچانک ماضی کی طرف چھلانگ لگا دیتا...... کمرے میں اٹھ کر ٹہلتا ہوں تو لگتا ہے، عبدل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اس کے قصوروار ہم ہیں — ہمارا خاندان۔ ابا نے اچانک اس کی چمڑے کی پٹی میں چھرا بھونک دیا۔ پانی کی جگہ سرخ سرخ خون گر رہا ہو۔

عبدل کے بعد کی دوسری نسل بھی اسی طرح ذبح کردی گئی خاموشی سے......

ہم تو لٹ گئے میاں۔ جاگیریں نہیں رہیں۔تمہارا کیا کریں۔ پھر جیسے اچانک دھند میں دو قدم آگے بڑھے اور مقتل کی طرف اٹھ گئے......

اشرف کے خون کی سرخیاں دھبوں کی طرح زمین اور آسمان پر بجھ گئیں۔

ایک خاندان دیکھتے دیکھتے اجڑ گیا۔ برباد ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ایک پیشہ گہن میں کھو گیا۔ اور تواریخ کی بوسیدہ قبر بارش کے پانی سے بیٹھنے لگی......

اسلم ......شاید اس دن اسلم نظر نہ آتا تو......

اس کا چہرہ۔ اس کی مضبوط پنڈلیاں۔ وقت کے دھارے میں اپنے لیے محفوظ کی گئی ایک جگہ......

اس رات، میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا......اور رات ہی رات میں نے فیصلہ کرلیا۔

ایلیشا سے پوچھ کر اسلم کو اپنے گھر لے آؤں گا۔ یقینی طور پر وہ میری بات مان جائے گا۔ رکشہ کی نوکری میں رکھا کیا ہے......خون پسینے بن جاتے ہیں اور عمر آنے سے پہلی زندگی کی کلیاں مرجھا کر جھڑ چکی ہوتی ہیں......

میں تمہارے کسی فیصلے پر انکار کیسے کرسکتی ہوں......''

یہ ایلیشا کا جواب تھا۔ میں مطمئن تھا۔ اور ایک بار پھر کوئی خدشہ مجھے اسلم کے دروازے تک لے گیا تھا۔

اچھا لگتا ہے نا—باہر کسی ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے اپنی نئی ٹاٹا سومو کو ٹھہرانا۔ بہت ساری بجھتی آنکھوں کے ساتھ ایک دروازے کی طرف بڑھ جانا۔ خاموش آنکھوں سے چپکے چپکے نذرانہ وصول کرتے رہنا......کہ ذرا دیکھو تو......گاڑی والا



آدمی ہے مگر ذرا بھی گھمنڈ نہیں۔

چھوٹی سی تنگ گلی کے پاس گاڑی رکتے ہی شور شرابے کا ایک بازار گرم ہو گیا تھا۔ میں نے خاموشی سے اسلم کے گھر کے دروازے کی کنڈی ہلائی۔ دو نسوانی ہاتھوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''مہرن۔''

اس کی آنکھوں میں حیرت تیر گئی، دھیرے سے گردن ہلائی۔ ''ہاں۔'' پھر دوسرے ہی لمحہ اندر اڑن چھو ہو گئی۔

مہرن......عمر کے ننھے گلیارے بھی کتنے بوسیدہ ہو جاتے ہیں—اچانک اس کے چہرے پر، بدن پر، عمر کی جلتی ریکھائیں لکھی دی گئی ہوں جیسے۔ اب وہ بچپنا، وہ معصومیت اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ ایک خاص طرح کی کٹھورتا، سختی اس کے چہرے پر خاموشی کے ساتھ جگہ بنانے لگی تھی......

صبح کا وقت تھا۔ آسمان پر سورج نمودار ہو چکا تھا۔ آنکھیں ملتا ہوا اسلم اچانک دروازہ پر آکر ٹھٹکا تھا۔ پھر جیسے اس کے ہوش اڑ گئے۔

''آپ! ارے آئیے۔''

یہ ایک چھوٹا سا سیلن زدہ کمرہ تھا۔ ایک اسٹول جس پر مہرن کے ہاتھ کی بنی چائے بھاپ دے رہی تھی، ایک کرسی جس پر میں بیٹھا تھا۔ اور سامنے زمین پر پاؤں موڑے اسلم۔ اسلم اچانک آنکھوں کے پردے پر عبدل تھرکنے لگا......

''منا بابو......''

''کیسے یاد کیا......؟''

اس کی آواز میں بہت زیادہ ملائمیت، جوش یا امنگ نہ تھی۔

''خبر کی ہوتی یا بلا یا ہوتا......مگر اس نے ایسا کچھ نہ کہا—یہ سب تو جیسے عبدل

کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا میں نے چائے کا گلاس تھام لیا۔ مہرن کی آنکھیں اس درمیان بدستور دروازے کی چوکھٹ سے لگی تھیں۔ میں اچانک جیسے سب کچھ بھول گیا۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ جذبات کی وہ کون سی کڑی تھی، جو مجھے اچانک یہاں لے کر آ گئی — یادوں کی جھلیاں جیسے دھیرے دھیرے یکے بہ دیگرے ادھڑ رہی تھیں۔ مجھے خیال آیا...... میں اسے لینے آیا تھا۔ ایک خاندان کا قرض تھا مجھ پر۔ اور شاید میرے جیسے کسی جذبات آدمی کو ایک نسل کا یہ قرض چکانے کا ایک موقع ملا تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ بات شروع کی......

''رکشہ چلا کر......''

''ہاں تھک جاتا ہوں......''

''کچھ اور کرنے کا خیال؟''

''نہیں، یہی ٹھیک ہے۔ دوسرا کیا کروں گا۔ مشکی تو بن نہیں سکتا۔ بن کر بھی کیا کرنا۔ مشکی تو بھیک مانگنے جیسا ہے۔ اب کون پوچھتا ہے؟''

''مہرن کی شادی؟''

''آپ سے کہا تھا کوئی لڑکا دیکھئے گا۔ عمر نکلی جا رہی ہے۔ ایک بار نکل گئی تو۔ جانتا ہوں پھر کوئی نہ پوچھے گا۔''

میں گردن جھکائے بہت دیر تک اپنے اندر کی کشمکش میں ڈوبے لفظوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''رکشہ چلانا تو بہت مشکل کام ہے......''

''ہاں......''

''کم عمری میں ٹی بی ہو جاتی ہے......''

اس بار اس کا لہجہ سخت تھا اور فیصلہ کن بھی......



''نہیں میرے کو یہ وقت نہیں آئے گا۔ مالوم کیوں! کیونکہ اس سے پہلے ہی میں یہ چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں چھوڑا تو؟''

''نہیں چھوڑا کیا۔ مجھے مالوم ہے پیسے کی قدر — وہ وقت نہیں آئے گا۔ اس واسطے میں نے سوچ رکھا ہے۔''

''کیا؟''

''جب ایسا ہوئے گا۔ اس سے پہلے مجھے بہوت پیسہ چاہئے۔''

''مگر پیسہ کہاں سے آئے گا؟''

''وہ بھی سوچ رکھا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''رات برات کسی پیسے والے مسافر کو بیٹھا کر اندھیرے میں چھرا نکال لوں گا۔''

''لوٹو گے؟''

''اپدیش مت دو بابو۔ جانتا ہوں۔ یہ کوئی جرم نہیں ہوگا۔ اپنی جان بچانے کو جو بھی راستہ اختیار کرو۔ جرم نہیں ہے۔ ایسا مسجد میں بھی سنا — سب سے بڑی چیز انسان کی زندگی ہے۔ منہ سے خون آنے سے پہلے ہی یہ کام چھوڑ دوں گا۔''

''جرم کرتے ہوئے تمہیں؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ جرم کون نہیں کرتا، کون سفید ہے یہاں؟''

وہ ہنس رہا تھا۔ ''اتنے بڑے کانڈ۔ اخبار نہیں پڑھتا ہوں تو کیا۔'' منہ سے خون نہیں آنے دوں گا۔ کچھ کروں گا۔''

میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔

''لیکن پولیس نے؟''

''پولیس بڑے بڑوں کو کاہے نہیں پکڑتی۔ مجھے نہیں پکڑے گی۔ کچھ دن لوٹ

پاٹ کے دھندے کے بعد کوئی بزنس شروع کردوں گا۔ سوچ رکھا ہے......'' وہ ہنس رہا تھا۔

چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی...... میرے اندر کچھ بیٹھا جارہا تھا...... میں نے کئی بار نگاہیں گھما کر اس کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر اس کا چہرہ یکسر جذبات سے عاری تھا۔ جیسے ابھی نہیں، اچانک نہیں، برسوں سے اپنی فکر کو جمع کرتا، کرتا وہ کسی نتیجہ پر پہنچ گیا ہو۔

گناہ، ثواب، جرم غلط اور ناجائز کی دلیلوں، منطقوں سے دور — شاید اسے زندہ رہنے کا فن آ گیا تھا۔

میرے قلب میں آسودگی کا ایک قطرہ اچانک ٹپکا۔ میں مسکرایا۔ میں اندر سے مسکرایا۔

مجھے پتہ تھا، میرے اگلے سوال کا وہ جواب کیا دے گا، مگر خوش تھا۔ پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔

''رکشہ چلانا چھوڑ کر میرے ساتھ چلو گے۔ رہو گے میرے ساتھ؟''

''نہیں صاحب''

''کیوں؟''

''بس، یہ مت پوچھو صاحب......''

وہ نظر جھکائے زمین کرید رہا تھا...... ''مجھے ابا نہیں بننا ہے۔ آگے اس کے بعد کچھ مت پوچھنا صاحب......''

مجھے اس سے اب اسی جواب کی امید تھی...... جرم تک جانیوالے غلط راستوں کے باوجود، مجھے خوشی تھی کہ وہ اپنے اچھے برے کو دیکھنے اور پرکھنے کے لائق ہوگیا ہے......اور اس کے لیے وہ کسی چودھری خاندان کا محتاج نہیں......



میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ مگر سارے راستے جیسے اسلم کی آواز میرے آگے پیچھے بازگشت کرتی رہی...... مجھے ابا نہیں بننا ہے......اسٹیرنگ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کرتے ہوئے مجھے لگا، وہ کہہ رہا ہو......

''منا بابو......اب ذبح نہیں ہونا ہے مجھے......ابا کی طرح......ابا مرے نہیں، سیدھے جانور کی طرح ذبح ہو گئے۔ آسانی سے۔''

''ہاں

ہم تیار نہیں ہیں۔ اس طرح

بار بار ذبح ہونے کے لیے۔''

●●